جولائی ۱۹۹۶ء

ماہنامہ

میثاق

لاہور

مدیر مسئول
ڈاکٹر اسرار احمد

۶۹ء سے ۷۱ء تک پاکستانی سیاست کی افراتفری کا اندوہناک نتیجہ:

مشرقی پاکستان کی علیحدگی

امیر تنظیم اسلامی کے ۷۲-۱۹۷۰ء کے سیاسی تجزیے

یکے از مطبوعات
تنظیم اسلامی

قرآن کالج لاہور۔اعلان داخلہ

برائے ایف اے (سیشن ۹۸۔۱۹۹۶ء)

- کالج ہذا میں دنیوی اور نصابی تعلیم کے ساتھ ساتھ دینی تعلیم کا بھی خاطر خواہ اہتمام کیا جاتا ہے۔
- کالج کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ اس کے نتائج عموماً سو فیصد رہتے ہیں۔
- اس سال ایف۔اے سال اول کے داخلے ان شاء اللہ جولائی کے اواخر تک مکمل کر لئے جائیں گے۔
- جو طلبہ اب تک مختلف بورڈوں کے ثانوی امتحان کے نتائج کی بناپر کامیاب قرار دیئے جاچکے ہیں' وہ کالج کے دفتر سے رابطہ کر کے پراسپکٹس حاصل کر لیں اور ایف۔اے میں داخلہ کے لئے فارم جمع کرادیں' کالج میں نشستیں محدود ہیں۔
- داخلے اور انٹرویو کی آخری تاریخ کا اعلان مختلف بورڈوں کے نتائج آنے کے بعد جلد کر دیا جائے گا۔

المعلن : پرنسپل قرآن کالج' اتاترک بلاک' نیو گارڈن ٹاؤن لاہور

فون : 5833637-5833638

وَاذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَمِيْثَاقَهُ الَّذِيْ وَاثَقَكُمْ بِهٖٓ اِذْ قُلْتُمْ سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا (القرآن)

ترجمہ: اور اپنے اُوپر اللہ کے فضل کو اور اس کے اُس میثاق کو یاد رکھو جو اُس نے تم سے لیا جبکہ تم نے اقرار کیا کہ ہم نے مانا اور اطاعت کی۔

جلد :	۴۵
شمارہ :	۷
صفر المظفر	۱۴۱۷ھ
جولائی	۱۹۹۶ء
فی شمارہ	-/۱۰
سالانہ زرتعاون	-/۱۰۰

ماہنامہ

میثاق

لاہور

مدیر مسئول

ڈاکٹر اسرار احمد

ادارہ تحریر

شیخ جمیل الرحمٰن

حافظ عاکف سعید

حافظ خالد محمود خضر

سالانہ زر تعاون برائے بیرونی ممالک

- ایران، ترکی، اومان، مسقط، عراق، الجزائر، مصر — 10 امریکی ڈالر
- سعودی عرب، کویت، بحرین، عرب امارات، قطر، بھارت، بنگلہ دیش، یورپ، جاپان — 17 امریکی ڈالر
- امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا، نیوزی لینڈ — 22 امریکی ڈالر

ترسیل زر: مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

مکتبہ مرکزی انجمن خدّام القرآن لاہور رجسٹرڈ

مقام اشاعت : 36۔کے، ماڈل ٹاؤن، لاہور 54700۔فون : 03-02-5869501

مرکزی دفتر تنظیم اسلامی : 67۔گڑھی شاہو، علامہ اقبال روڈ، لاہور، فون : 6305110

پبلشر: ناظم مکتبہ، مرکزی انجمن، طابع : رشید احمد چودھری، مطبع : مکتبہ جدید پریس (پرائیویٹ) لمیٹڈ

مشمولات

☆ تذکرہ و تبصرہ ____________ ۳

حافظ عاکف سعید

☆ تقدیم ____________ ۷

○ مقدمہ الخلافۃ الکبریٰ (خواجہ عبدالحیٔ فاروقیؒ)

○ انوار القرآن (مولوی انیس احمدؒ)

از قلم : ڈاکٹر اسرار احمد

○ تعارف انوار القرآن

از قلم : شاہد احمد

☆ حیاتِ اقبال ____________ ۲۵

ایک گم شدہ ورق (۲)

حافظ عاکف سعید

☆ تازہ خواہی داشتن ____________ ۴۱

پاکستانی سیاست کا پہلا عوامی و ہنگامی دور (۳)

○ "دیکھ کعبے میں شکستِ رشتہ تسبیح شیخ!"

○ پاکستان کی مذہبی سیاست کا نیا ہدف :

-"برسراقتدار طبقہ" کی بجائے "سوشلزم"

○ "....وقتِ دعا ہے!"

○ ۶۹ء سے ۷۱ء تک پاکستان کی سیاست کی افراتفری کا اندوہناک نتیجہ :
مشرقی پاکستان کی علیحدگی

امیر تنظیم اسلامی کے ۷۲۔۷۰ء کے سیاسی تجزیے

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

تذکرہ و تبصرہ

زیرِ نظر شمارے کے ساتھ بحمد اللہ' امیر تنظیم اسلامی محترم ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کی ادارت و اہتمام میں ماہنامہ "میثاق" کی اشاعت کے تیس سال پورے ہو گئے ہیں۔ محترم ڈاکٹر صاحب نے ۱۹۶۶ء میں اس پرچے کی ادارت سنبھالی تھی اور ان کے زیر ادارت میثاق کا پہلا شمارہ جولائی ۱۹۶۶ء میں شائع ہوا تھا۔ یہ وہ دور تھا جب تنظیم اسلامی قائم ہوئی تھی نہ انجمن خدام القرآن کا قیام عمل میں آیا تھا بلکہ محترم ڈاکٹر صاحب نے اللہ تعالیٰ کی نصرت و تائید کے بھروسے پر تن تنہا ایک عظیم مقصد کے حصول کے لئے سفر کا آغاز کیا تھا۔ گویا۔

میں اکیلا ہی چلا تھا جانبِ منزل مگر راہرو ملتے گئے اور کارواں بنتا گیا

ادھر کچھ عرصے سے دعوتی و تنظیمی مصروفیات میں بے پناہ اضافے کے باعث امیر تنظیم نے میثاق کی اکثر ادارتی ذمہ داریوں' بالخصوص ادارتی صفحات تحریر کرنے کی پابندی سے خود کو بہت حد تک فارغ کیا ہوا ہے' چنانچہ آج کل میثاق کے قارئین کو محترم ڈاکٹر صاحب کا تحریر کردہ اداریہ شاذ و نادر ہی پڑھنے کو ملتا ہے' تاہم ابتدائی سالوں میں محترم ڈاکٹر صاحب بڑی پابندی اور اہتمام سے میثاق کے اداریئے تحریر فرماتے رہے اور ان کے اداریئے بڑے شوق اور توجہ سے پڑھے جاتے تھے۔ محترم ڈاکٹر صاحب کے تحریر کردہ اکثر و بیشتر اداریئے دینی اور تحریکی موضوعات پر مشتمل ہوتے تھے اور ان میں وقتی حالات کے حوالے سے گفتگو اور ملکی سیاسی صورتحال پر تبصرے کا عنصر تقریباً نہ ہونے کے برابر تھا۔ چنانچہ اس پر بعض احباب نے شکوے کے انداز میں اور بعض نے تنقید بلکہ استہزاء کے پیرائے میں بھی اس رائے کا اظہار کیا کہ کسی ماہانہ پرچے کے ادارتی صفحات میں حالات حاضرہ کے حوالے سے گفتگو اور ملکی سیاست کے اتار چڑھاؤ پر تبصرہ تو ایک ناگزیر ضرورت ہے' ادارتی صفحات میں ان موضوعات سے گریز ناقابل فہم ہے!!!... اس کے جواب میں محترم ڈاکٹر صاحب کی جو تحریر "تذکرہ و تبصرہ" کے عنوان سے جولائی ۱۹۶۸ء کے میثاق میں شائع ہوئی اس کے ذریعے چونکہ اس امر کی وضاحت بہت ہی عمدگی کے ساتھ ہوتی ہے کہ انہوں نے گوشۂ صحافت میں قدم کیوں رکھا' "میثاق" کا اجراء کس مقصد کے پیش نظر ہوا اور کن حالات میں ہوا' لہٰذا آج جب کہ ان کے زیر ادارت اس پرچے کی اشاعت کو تیس برس مکمل ہو گئے ہیں اور اس طرح ماہنامہ میثاق نے اپنے سفرِ حیات کا ایک اہم سنگ میل عبور کیا ہے' ذیل میں اس تحریر کو ہدیہ قارئین کیا جا رہا ہے :

"گزشتہ شمارے کے ساتھ راقم الحروف کے زیر ادارت "میثاق" کے دو سال مکمل ہو گئے تھے اور زیر نظر اشاعت سے تیسرے سال کی ابتدا ہو رہی ہے۔ دو سال کی اس مدت میں

"میثاق" کے ذریعے اگر دین کی کوئی بری بھلی خدمت ہوئی ہے تو وہ محض اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے ہے ----- اور اگر کسی کوتاہی یا غلطی کا صدور ہوا ہے تو وہ یقیناً میری نااہلی اور شرارتِ نفس کی بنا پر ہے۔ آئندہ بھی صرف اللہ تعالیٰ کی ہدایت و رہنمائی کی امید اور اس کے اس حتمی وعدے پر پختہ یقین کی بنا پر کہ :

وَالَّذِينَ جَاهَدُوا فِينَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا (العنکبوت : ۶۹)

"اور جو لوگ ہماری اس راہ میں کوشش کریں گے ہم لازماً انہیں اپنے راستوں پر چلائیں گے"

اس دعا کے ساتھ اس سفر کو جاری رکھنے کا عزم ہے کہ :

رَبَّنَا اَرِنَا الْحَقَّ حَقًّا وَارْزُقْنَا اتِّبَاعَهٗ وَاَرِنَا الْبَاطِلَ بَاطِلًا وَارْزُقْنَا اجْتِنَابَهٗ (آمین)

صحافت نہ تو راقم الحروف کا "پیشہ" ہے اور نہ "مشغلہ"۔

جہاں تک کسب معاش کا تعلق ہے اس کے لئے اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل و کرم سے مجھے وہ ذریعہ عطا فرمایا تھا جو سب کے نزدیک دنیا کا شریف ترین پیشہ ہے۔ پھر میرے بارے میں کسی نے چاہے اور کچھ بھی کہا ہو' مجھ پر غبی ہونے کا الزام آج تک کسی نے نہیں لگایا ----- یہ بالکل دوسری بات ہے کہ اپنے دورِ تعلیم کے انتہائی اہم زمانے میں ایک تحریک اور اس کی دعوت سے متاثر ہوا اور فوری طور پر میں نے پورے فہم اور شعور کے ساتھ یہ فیصلہ کر لیا کہ میری زندگی میں اولیت اس تحریک اور اس کی دعوت کو حاصل ہو گی' معاش اور کسب معاش کے ذریعے (یعنی PROFESSIONAL CAREER) کو بالکل ثانوی مقام حاصل ہو گا۔ تعلیم کے اختتام اور عملی زندگی کے آغاز کے بعد بھی قلب کی گہرائیوں سے ابھرنے والے بعض تقاضوں اور روح کی پہنائیوں سے اٹھنے والے بعض مطالبوں نے مسلسل بے چین کئے رکھا۔ چنانچہ مروجہ معیارات کے مطابق "پیشہ ورانہ کامیابی" کے بنیادی لوازم ----- یعنی توجہ کا ارتکاز ----- اور ایک مقام پر مستقل قیام ----- کبھی پورے نہ کئے جا سکے۔ واقعہ یہ ہے کہ اس دوران میں جب بھی کبھی ایسا ہوا کہ پیشہ ورانہ مصروفیت میں اضافہ ہوتا اور وقت اور توجہ کا معتدبہ حصہ اس میں صرف ہونے لگتا تو قلب و روح کی گہرائیوں سے وہی صدا بلند ہونے لگتی جو ایک روایت کے مطابق ایک شکار کے دوران ایک بیابان میں حضرت ابراہیم بن ادھم کو سنائی دی تھی کہ

یَا ابراهیمُ اَلِهٰذا خُلِقتَ اَم بِهٰذا اُمِرتَ ؟

(اے ابراہیم کیا اسی کام کیلئے تمہیں پیدا کیا گیا ہے یا کیا اس کا تمہیں حکم ملا ہے؟)

نتیجتاً طبیعت میں توحش پیدا ہو جاتا ---- اور پیشہ ورانہ مصروفیت سے دل بالکل اچاٹ ہو جاتا! معاش میں استحکام ---- اور پیشہ و فن میں تمکن کا اصل زمانہ یعنی اختتام تعلیم سے لے کر مسلسل دس بارہ سال تک کا عرصہ میں نے اس حال میں گزارا کہ جہاں کی فضا اپنے "مقصد زندگی" کے لئے نسبتاً زیادہ سازگار نظر آئی اپنا سارا بوریا بستر سمیٹ کر وہاں چل دیا اور ایک لمحے کے لئے بھی یہ نہ سوچا کہ ایک مقام پر ایک عرصہ تک قیام کی بنا پر معاشی و فنی اعتبار سے جو حیثیت بنی ہے اس کو اس طرح نظر انداز کرنے سے معاشی مستقبل کتنا مخدوش ہو جائے گا ---- حد یہ ہے کہ ایک بار "مقصد زندگی" کے نام پر دی جانے والی ایک دعوت کی بنا پر پیشہ و فن کی پوری بساط ہی لپیٹ کر رکھ دی ---- الغرض مسلسل آج کل یہاں وہاں' پرسوں کہیں اور اگلے روز کہیں اور کی حالت طاری رہی ---- لوگ تلون اور غیر مستقل مزاجی کی پھبتیاں کستے رہے' لیکن میں اپنے باطن کا جائزہ لیتا تو یہ معلوم کر کے مطمئن ہو جاتا کہ میرے اس ظاہری تلون کا اصل سبب بحمد اللہ اپنے اس قدیم فیصلے پر پوری "مستقل مزاجی" کے ساتھ عمل پیرا رہنا تھا کہ میری زندگی میں اولیت بہرحال "مقصد زندگی" کو حاصل رہے گی' معاش اور اس کے متضمنات ہمیشہ ثانوی رہیں گے! ---- ایک طویل عرصے تک ادھر ادھر کی ٹھوکریں کھانے کے بعد آج سے دو ڈھائی سال قبل حکمت خداوندی اور مشیت ایزدی کے تحت یہ صورت پیدا ہوئی کہ میں لاہور منتقل ہوا ---- اور یہاں مقصد زندگی کے لئے خالص "ذاتی حیثیت" میں ایک حقیر جدوجہد کے آغاز کے طور پر پہلے "تحریک جماعت اسلامی" کی اشاعت اور پھر "میثاق" کے از سر نو اجراء کا اہتمام کیا ---- !

رہا "شوق" کا معاملہ تو خدا جانتا ہے کہ "لکھنے" کا شوق مجھے کبھی نہیں رہا۔ اس کے برعکس واقعہ یہ ہے کہ "لکھنا" مجھے ہمیشہ ایک نہایت مشکل اور نہایت کٹھن کام نظر آیا۔ نہ تو کبھی میرا یہ مشغلہ (HOBBY) رہا اور نہ ہی کبھی میں نے اس کی مشق کی۔ اور واقعہ یہ ہے کہ میرا ذاتی احساس یہ ہے کہ اس "فن" کے ابجد تک سے میں تاحال ناواقف ہوں۔ اسلامی جمعیت طلبہ سے وابستگی کے دوران خالص تنظیمی نوعیت کی چند تحریروں یا ایک آدھ واردات قلبی کے اظہار کے قبیل کی چیزوں کے علاوہ پورے زمانہ طالب علمی میں میں نے کبھی کچھ نہ لکھا ---- اس کے بعد مسلسل دو سال تک ایک حرف بھی قلم سے نہ نکلا'

لیکن پھر اچانک مقصدِ زندگی کی لگن اور اس کے ساتھ شدید ذہنی وابستگی سے یہ "معجزہ" صادر ہوا کہ اکتوبر ۱۹۵۶ء میں دس پندرہ دن کی مدت میں سوا دو سو صفحات پر مشتمل وہ بیان تحریر میں آگیا جواب "تحریک جماعت اسلامی" کی صورت میں مطبوعہ موجود ہے۔

اس کے بعد مسلسل دس سال پھر اس حال میں گزرے کہ ایک حرف بھی قلم سے نہ نکلا حتیٰ کہ اس پورے عرصہ میں خطوط بھی چند بالکل گنے چنے ہی لکھنے میں آئے ---- تا آنکہ جولائی ۱۹۶۶ء میں "میثاق" کا دوبارہ اجراء عمل میں آیا۔ اس کے بعد کی قلمی "داستان" سے قارئین "میثاق" بخوبی واقف ہی ہیں۔

یہ پوری داستان بے اختیار اس لئے نوکِ قلم پر آگئی کہ حال ہی میں چند مخلصین نے یہ شکوہ کیا ہے کہ "رسائل و اخبارات کے اداریئے وقتی حالات و مسائل پر تبصرے کے لئے ہوتے ہیں، تم ان میں بھی ثقیل مضامین بھر کر "صحافت" کے معروف اصولوں کو توڑ رہے ہو----!" اور بعض دوسرے حضرات نے یہ طعنہ دیا ہے کہ "معلوم ہوتا ہے کہ تمہارے پاس "لکھنے" کے لئے کچھ ہے ہی نہیں!"

میری گزارش اپنے ان تمام دوستوں اور بزرگوں سے یہ ہے کہ واقعتاً صحافت نہ میرا پیشہ ہے نہ مشغلہ!---- لہٰذا صحافت کے مروجہ معیارات کے مطابق میری جانچ پرکھ مجھ پر شدید زیادتی ہے۔ علامہ اقبال کو جو گلہ اپنے دوستوں سے تھا کہ ؎

مرا یاراں غزلخوانے شمردند!

وہی مجھے اپنے ان مخلصوں سے ہے کہ وہ مجھے صحافی سمجھ رہے ہیں۔ میں نے ہرگز صحافت کا شوق پورا کرنے کے لئے اس کوچے میں قدم نہیں رکھا' بلکہ "میثاق" کا اجراء صرف اپنے مقصد زندگی کے حصول کی جدوجہد کے لئے کیا ہے۔ میں سچ عرض کرتا ہوں کہ مجھے اس وسیع و عریض دنیا میں اپنے مقصد اور اس کی جدوجہد سے بڑھ کر اہم چیز کوئی نظر ہی نہیں آتی! موجودہ حالات و واقعات میرے نزدیک بذاتہٖ اور فی نفسہٖ نہ کوئی علیحدہ وجود رکھتے ہیں نہ مستقل اہمیت کہ ان پر تبصرہ کسی افادیت کا حامل ہو۔ مجھے اس ایک مقصد کے سوا کسی چیز سے کوئی دلچسپی ہی نہیں ہے کہ مسلمان جیوں اور مومن مروں۔ میری سب سے بڑی آرزو یہ ہے کہ خود میرا سینہ بھی نورِ ایمان سے منور ہو------- اور زیادہ سے زیادہ لوگوں کے قلوب و اذہان بھی اسی نور سے جگمگا اٹھیں تاکہ وہ بھی اسلام پر زندہ رہیں اور ایمان پر اس دنیا سے رخصت ہوں۔ پھر کوئی جماعت یا تنظیم ایسی مل جائے جو اس مقصد کے لئے

(باقی صفحہ ۲۳ پر)

امام الہند شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے انقلابی نظریات کے علمبردار

اور

شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندیؒ کے جہادِ حریّت کے رفیق کار

مولانا عبید اللہ سندھی

کی قرآنی درس گاہ

نظارت المعارف القرآنیہ (دہلی)

کے دو[1] فارغ التحصیل خادمانِ قرآن:

۱۔ خواجہ عبدالحیٔ فاروقی ——— اور

۲۔ مولوی انیس احمد بی اے (علیگ) کے

دو[2] زیرِ طبع تبرّکاتِ علمی[1] کی تقدیم

——— ازقلم ———

ڈاکٹر اسرار احمد

اور مولوی انیس احمد اور ان کی تالیف 'انوار القرآن' کا تعارف

ازقلم : شاہد احمد خلف الرشید انیس احمد

---

[1] : یہ دونوں تبرّکات علمیہ اِن شاء اللہ جلد کتابی صورت میں شائع ہو جائیں گے۔

مولانا عبد الحیٔ فاروقیؒ کی تفسیر سورۃ بقرہ بعنوان

الخلافۃ الکبریٰ

کے مقدّمہ کی تقدیم

خواجہ عبدالحیٔ فاروقیؒ کا نام میں نے پہلی بار حاجی عبدالواحدؒ کی زبانی سنا تھا لہٰذا پیش نظر کتابچے کی تقدیم کے ضمن میں اولاً حاجی صاحب موصوف کا تعارف ضروری ہے اور اس کے لئے بجائے اس وقت کچھ لکھنے کے' ذیل میں وہی تحریر جوں کی توں درج کی جا رہی ہے جو ۱۹۷۸ء میں خواجہ عبدالحیٔ فاروقیؒ کی تفسیر سورۂ بقرہ موسوم بہ "الخلافۃ الکبریٰ" کا مقدمہ "میثاق" میں شائع کرتے ہوئے سپرد قلم ہوئی تھی ---- وھو ھذا :

"حاجی عبدالواحد مدّ ظلہ' دینی حلقوں کی ایک معروف اور جانی پہچانی شخصیت ہیں اور راقم الحروف انہیں اپنا خیر خواہ اور معاون ہی نہیں سرپرست اور بزرگ سمجھتا ہے۔

دوسری طرف حاجی صاحب کا جو معاملہ راقم کے ساتھ ہے اس کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ ۷۲ء میں راقم کے دو تین درسوں ہی میں شرکت کے بعد حاجی صاحب نے اولاً تو یہ فرمایا "کاش کہ میں اُس وقت تک زندہ رہوں اور آپ کے کچھ کام آسکوں جب مولوی آپ پر جھپٹیں گے!" اور پھر کچھ ہی عرصہ بعد ایک دن اچانک راقم کا ہاتھ کھینچ کر اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے فرمایا : "احیائے دین کی جدوجہد کے لئے میں آپ کے ہاتھ پر سمع و طاعت اور جہاد و ہجرت کی بیعت کرتا ہوں!" جس پر راقم سراسیمہ سا ہو کر رہ گیا۔ لیکن اس دن سے آج تک حاجی صاحب اپنے اس عہد کو کمال وفاداری کے ساتھ نبھا رہے ہیں' جس سے کم از کم ان کے معاملے میں راقم کو شدید شرمندگی کا احساس ہوتا ہے!

۱۹۳۲ء میں انگریزی ادب میں ایم اے کرنے والے اور محکمہ تعلیم میں ایک اعلیٰ

عہدے پر فائز اس باہمت شخص نے عین جوانی میں جبکہ دنیوی ترقی کا ایک وسیع و عریض میدان ان کے سامنے تھا اپنی تمام صلاحیتوں اور توانائیوں کو صرف احیائے اسلام کی جدوجہد کے لئے وقف کر دینے کے عزم مصمم کے ساتھ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر مجاہدانہ زندگی اختیار کر لی تھی۔ چنانچہ بالکل نوجوانی میں خلافت اور ہجرت کی تحریکوں میں حصہ لینے کے بعد سے برِعظیم پاک و ہند میں اٹھنے والی ہر احیائی تحریک کا انہوں نے قریب سے مطالعہ کیا اور بعض کے ساتھ طویل عرصے تک سرگرمی کے ساتھ کام بھی کیا۔ چنانچہ وہ ایک طرف مولانا عبید اللہ سندھی کے ساتھ مسلسل ایک برس مکہ معظمہ میں قیام پذیر رہے تو دوسری طرف شیخ طریقت مولانا عبد القادر رائے پوریؒ کی خدمت میں حاضری کی خاطر ایک خاصا طویل عرصہ خانقاہ رائے پور میں مقیم رہے۔ اسی طرح ایک جانب مولانا مودودی کے ساتھ ان کا ذہنی سفر "ترجمان القرآن" کی ادارت کے آغاز سے تشکیلِ جماعت اسلامی تک جاری رہا (جس میں وہ بوجوہ شامل نہ ہوئے) تو دوسری جانب وہ مولانا محمد الیاسؒ کی خدمت میں بھی حاضر ہوئے اور ایک طویل عرصے تک نہایت سرگرمی اور جوش و خروش کے ساتھ تبلیغی جماعت میں کام کرتے رہے۔ اسی طرح ادھر لاہور میں حضرت مولانا احمد علی لاہوریؒ سے انہیں انتہائی قرب حاصل رہا تو ادھر مولانا محمد منظور نعمانی مدیر 'الفرقان' لکھنؤ سے بھی ان کے دوستانہ مراسم قائم رہے ---- اور مولانا سید ابو الحسن علی ندوی کے ساتھ تو شاگردی اور استادی کا دو طرفہ تعلق رہا۔ یعنی یہ کہ جب وہ ایک سال کے لئے ندوۃ العلماء لکھنؤ میں مقیم رہے تو انہوں نے مولانا علی میاں سے عربی سیکھی اور مولانا علی میاں نے ان سے انگریزی پڑھی، اور تاحال مولانا علی میاں کو جو تعلقِ خاطر ان سے ہے اس کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ حال ہی میں جب پاکستان تشریف آوری کا موقع ہوا تو انہوں نے حاجی صاحب کو خط میں بھی یہ لکھا کہ "میں پاکستان صرف آپ سے ملاقات کے لئے آنا چاہتا ہوں!" اور پھر اپنی بے انتہا مصروفیات کے علی الرغم انہوں نے واقعتاً حاجی صاحب کے مکان پر حاضری دی ---- بلکہ چونکہ اپنی شدید مصروفیات کے باعث اس "حاضری" میں قدرے تاخیر ہو گئی تھی للذا اس پر وہاں ایک سعادت مند خورد کی حیثیت سے حاجی صاحب کی "بزرگانہ ڈانٹ" بھی پورے صبر و سکون کے ساتھ سنی ----

یہ ساری تفصیل تمہید ہے اس بات کی کہ حاجی صاحب راقم کے ساتھ گفتگو میں اکثر خواجہ عبدالحیؒ کا ذکر فرمایا کرتے تھے اور اس کا برملا اعتراف کیا کرتے تھے کہ انکی زندگی کے رخ کو موڑنے والے اصل میں وہ دروسِ قرآن تھے جو خواجہ صاحب اسلامیہ کالج لاہور کے قریب برانڈرتھ روڈ کے کسی چوبارے میں دیا کرتے تھے اور جن میں حاجی صاحب نے اپنے زمانہ طالب علمی میں شرکت کی تھی---ایک دوبار حاجی صاحب کی زبان سے یہ الفاظ بھی نکلے کہ "خواجہ صاحب اُس وقت کے ڈاکٹر اسرار احمد تھے اور ڈاکٹر اسرار آج کے خواجہ عبدالحیٰ فاروقی ہیں!" راقم خواجہ صاحب سے بالکل واقف نہ تھا لیکن حاجی صاحب کے اس ذکر سے انکی ذات سے ایک ذہنی تعلّق اور قلبی اُنس قائم ہو گیا---

اسی دوران میں ایک روز اچانک ملک ظفراللہ خان صاحب (خلف الرشید ملک نصر اللہ خان عزیز مرحوم جو اولاً مولانا ابوالکلام آزاد کی "حزب اللہ" اور پھر مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کی جماعت اسلامی میں فعال طور پر شریک رہے تھے) ایک بوسیدہ سی کتاب لئے ہوئے آئے اور انہوں نے فرمایا: "ابا جان کے سامان میں سے بہت سی بوسیدہ و کرم خوردہ کتابوں کے ڈھیر میں سے یہ کتاب بھی ملی ہے' شاید آپ کو اس سے دلچسپی ہو!" اب جو راقم نے دیکھا تو وہ "الخلافۃ الکبریٰ" تھی "یعنی سورۂ بقرہ کی انقلابی رنگ میں تحریر شدہ تفسیر از قلم خواجہ عبدالحیٰ فاروقی" اور اس کا صرف "مقدمہ" ہی پوری طرح ثابت و سالم تھا۔ بہر حال اس کو پڑھ کر اندازہ ہوا کہ حاجی صاحب کا فرمانا بالکل ٹھیک ہے اور یہ خالص وہی فکر ہے جسے خود راقم اپنی حقیر صلاحیت اور محدود استعداد کے مطابق پھیلانے کی کوشش کر رہا ہے! چنانچہ راقم نے اسی وقت طے کر لیا تھا کہ کم از کم اس کے مقدمے کو ضرور شائع کیا جائے گا اور اس کے لئے اصل کتاب ہی کا عکس استعمال ہو گا۔ اس غرض سے دو سال سے ان صفحات کے پوزیٹو بنے رکھے تھے لیکن کوئی موقع نہ آرہا تھا۔ آج بحمدِ اللہ راقم کی وہ خواہش پوری ہو رہی ہے۔

اس تبرکِ علمی و دینی کے تعارف کا ایک دوسرا رخ بھی ضروری ہے اور وہ یہ کہ اس کا تعلق علم و تفسیر قرآن کے اس "انقلابی" مزاج کے حامل سلسلے سے ہے جو اس صدی کے اوائل میں حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندی رحمتہ اللہ علیہ کی ذات بابرکات سے

شروع ہوا تھا، جس کے خلیفۂ اول کی حیثیت حاصل تھی مولانا عبید اللہ سندھی کو جو اواخرِ عمر میں کچھ زیادہ ہی "انقلابی" ہو گئے تھے اور خلیفۂ ثانی کا درجہ حاصل تھا مولانا احمد علی لاہوری رحمتہ اللہ علیہ کو جو عمر کے آخری دور میں اغلباً اعوان و انصار کی کمی اور حالات کے ہاتھوں مجبور ہو کر انقلابیت سے کسی قدر رجعت فرما کر روحانیت اور بیعتِ ارشاد ہی میں منہمک ہو گئے تھے اور تیسری اہم شخصیت تھی خواجہ عبد الحیٔ فاروقیؒ کی جو اغلباً از اول تا آخر معتدل مزاج کے حامل رہے اور ان کے انقلابی فکرِ قرآنی نے نہ تو کوئی بڑی زقند لگائی اور نہ کسی درجے میں رجعت ہی اختیار کی!

راقم نے آج سے ٹھیک دو سال قبل "میثاق" بابت دسمبر ۱۹۷۶ء میں ایک طویل مضمون میں تفسیرِ قرآن کی ان مختلف شاخوں کا جائزہ لیا تھا جو برِّعظیم پاک و ہند میں انیسویں صدی عیسوی کے اواخر اور بیسویں صدی کے اوائل میں پھلی پھولیں۔ (یہ تحریر اب راقم کی تالیف "دعوت رجوع الی القرآن کا منظر و پس منظر" میں شامل ہے!) ان میں قادیانی و لاہوری سلسلے سے قطع نظر جو "ضَلَّ ضَلٰلًا بَعِیدًا" کا مصداقِ کامل بن گیا، ایک انتہا پر تو متجددین کا سلسلہ تھا جس کے بانی مبانی تھے سرسید مرحوم، اور ان کے اہم خلفاء میں شامل ہیں علامہ عنایت اللہ خان مشرقی اور چوہدری غلام احمد پرویز، اور دوسری انتہا پر تھے "الرّٰاسِخُوْنَ فِی الْعِلْمِ" جن کے سیّد الطائفہ تھے حضرت شیخ الہندؒ۔ اور ان کے مابین تھیں تین درمیانی رنگ کی حامل شاخیں جو ---- مولانا ابو الکلام آزاد، مولانا حمید الدین فراہی اور علامہ اقبال سے شروع ہوئیں اور جن کے خلفاءِ عظام ہیں علی الترتیب مولانا مودودی، مولانا اصلاحی اور ڈاکٹر رفیع الدین۔ علماءِ راسخین کے حلقے کی دوسری اہم شخصیت ہیں مولانا شاہ اشرف علی تھانویؒ جن کے بارے میں راقم لکھ چکا ہے کہ ان کی تفسیر بیان القرآن سے تین تفسیریں مزید نکلی ہیں، ایک مولانا عبد الماجد دریابادی مرحوم کی، دوسری مولانا محمد ادریس کاندھلویؒ کی اور تیسری مفتی محمد شفیعؒ کی۔ البتہ خاص حضرت شیخ الہندؒ کی ذاتِ بابرکات سے تفسیرِ قرآن کے جو دو چشمے پھوٹے ان میں سے متذکرہ بالا تحریر میں صرف ایک کا ذکر ہوا تھا یعنی مولانا شبیر احمد عثمانیؒ کے حد درجہ سلیس لیکن انتہائی عمیق حواشی کا۔ لیکن دوسرے اہم سلسلے کا ذکر رہ گیا تھا جس کے اہم افراد ہیں مولانا عبید اللہ

سندھی مرحوم' مولانا احمد علی لاہوری" اور خواجہ عبدالحیٔ فاروقی"۔

راقم ایک دوسرے موقع پر "میثاق" ہی میں اپنی اس رائے کا اظہار بھی کر چکا ہے کہ چودھویں صدی عیسوی کے اصل مجدد حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن" ہیں۔ (یہ تحریر اب راقم کی تالیف: "جماعت شیخ الہند" اور تنظیم اسلامی" میں شامل ہے)۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ جو جامعیتِ کبریٰ ان کی ذات میں نظر آتی ہے وہ اس صدی کے اعاظم رجال میں سے اور کسی میں نظر نہیں آتی۔ تعلیمی و تصنیفی کام بھی اپنی جگہ حد درجہ اہمیت کا حامل ہے اور تزکیۂ نفوس اور مجاہدہ مع النفس کی عظمت سے بھی ہرگز انکار ممکن نہیں' لیکن صدی کے مجدد کا جامہ اسی پر راست آتا ہے جو ان دونوں میدانوں میں بھی مسلّمہ حیثیت کے حامل ہونے کے ساتھ ساتھ مجاہدہ مع الکفار کے میدان میں بھی سرگرم نظر آئے اور قید و بند کی صعوبتیں بھی جھیلے اور دار و رسن کو بھی رونق بخشے۔ اور اس صدی میں ان تینوں پہلوؤں کو اپنی ذات میں بتمام و کمال جمع کرنے والی شخصیت صرف حضرت شیخ الہند" کی ہے۔ چنانچہ ان کی ذات سے فکرِ قرآنی کی ایک انقلابی مزاج کی حامل شاخ بھی پھوٹی جس کے گلِ سرسبد ہیں یہ تین حضرات جن کا ذکر اوپر ہو چکا ہے۔

الغرض ---- علم و تفسیرِ قرآن اور دعوت رجوع الی القرآن یا تحریکِ تعلیم و تعلّم القرآن کے اس جائزے یا تجزیئے میں جو راقم الحروف نے دسمبر ۷۶ء کے "میثاق" میں سپرد قلم کیا تھا ایک کمی رہ گئی تھی جس کی تلافی ان سطور کی تحریر اور "الخلافۃ الکبریٰ" کے مقدمے کی اشاعت سے مطلوب ہے!"

(میثاق لاہور بابت نومبر دسمبر ۷۸ء)

"الخلافۃ الکبریٰ" کا یہ مقدمہ اُس وقت تو صرف "میثاق" میں شائع ہو کر رہ گیا تھا۔ اب حال ہی میں جب مولانا عبیداللہ سندھی" کے ایک اور شاگرد (جو رشتے میں میرے ماموں بھی تھے) مولوی انیس احمد بی اے (علیگ) کی ایک تالیف "انوار القرآن" کی اشاعت کا فیصلہ ہوا تو خیال آیا کہ خواجہ عبدالحیٔ" کے اس تبرکِ علمی کو بھی کتابچے کی صورت میں شائع کر دیا جائے۔

خاکسار اسرار احمد عفی عنہ

مولوی انیس احمد بی اے (علیگ) کی تالیف

انوار القرآن

کی تقدیم

یہ ۴۰-۱۹۴۱ء کی بات ہے جب میں تیسری چوتھی جماعت کا طالب علم تھا' اور ہم حصار میں ریلوے سٹیشن سے بالکل متصل اپنے اس نئے مکان میں رہائش پذیر تھے جو والد صاحب مرحوم و مغفور نے چند سال قبل ہی تعمیر کرایا تھا' کہ میرے مشاہدے میں آیا کہ دو حسین و دیدہ زیب کتابوں کے دو سیٹ ہمارے یہاں بہت اہتمام کے ساتھ رکھے ہوئے ہیں۔ چنانچہ ایک سیٹ مردان خانے کی "بیٹھک" میں رکھی ہوئی میز کی دراز میں مستقلاً موجود رہتا تھا' اور دوسرا منقسم طور پر دو جز دانوں میں خواجہ حسن نظامی مرحوم کے ترجمے اور حواشی والے قرآن مجید کی ان دو جلدوں (پندرہ پندرہ پاروں پر مشتمل) کے ساتھ رکھا رہتا تھا جو والدہ صاحبہ مرحومہ کے زیر تلاوت رہتی تھیں! (مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ یہ دونوں جلدیں "متاعِ عزیز" کے طور پر اس مختصر ترین سامان کے ساتھ بھی پاکستان پہنچ گئی تھیں جس کے ساتھ ہمارے خاندان نے حصار سے سلیمانکی ہیڈورکس تک کا ایک سو ستر میل کا فاصلہ آگ اور خون کے دریا عبور کرکے بیس روز میں طے کیا تھا۔ پھر پاکستان میں بھی والدہ صاحبہ مرحومہ کی یہ "متاعِ عزیز" نہایت بوسیدہ ہو جانے کے باوجود کئی سال تک محفوظ رہی۔ تاآنکہ والدہ صاحبہ نے میرے مشورہ پر پچاس کی دہائی کے اوائل میں حضرت شیخ الہندؒ کے ترجمے اور مولانا شبیر احمد عثمانیؒ کے حواشی والے مصحف کی تلاوت شروع کی۔)

بہرحال' متذکرہ بالا دو کتابوں کے نام تھے : تعلیم القرآن اور کلید القرآن۔ اور ان دونوں پر مصنف کا نام تحریر تھا "انیس احمد۔ بی اے (علیگ)"۔ پھر یہ بھی اچھی طرح یاد ہے کہ ان ہی دنوں یہ بھی معلوم ہو گیا تھا کہ یہ انیس احمد والدہ صاحبہ کے حقیقی پھوپھی زاد بھائی

ہیں۔ تاہم یہ یاد نہیں کہ میں نے کبھی ان کتابوں کو توجہ کے ساتھ پڑھا بھی ہو۔ ہائی اسکول کے زمانے میں اولاً مجھ پر "بانگِ درا" چھائی رہی' بعد ازاں کچھ حفیظ جالندھری کا "شاہنامہ" اور کچھ مولانا مودودی کے ابتدائی کتابچے زیرِ مطالعہ رہے' اور زیادہ تر وقت مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن کی عملی سرگرمیوں کے نذر ہوا۔

میڈیکل کالج کی تعلیم کے دوران جب ذرا معلومات کا دائرہ وسیع ہوا اور حلقہ دیوبند کے بعض حضرات سے تعارف حاصل ہوا تو کان کھڑے ہوئے کہ یہ مولوی انیس احمد تو بہت بدنام انسان تھے اور ان پر حضرت شیخ الہندؒ سے غداری اور انکے خلاف مخبری کا الزام تھا۔ چنانچہ دل ہی دل میں شرم اور ندامت کا احساس بھی پیدا ہوا اور ان کے ساتھ اپنی رشتہ داری کی نسبت کو چھپائے رکھنے ہی میں عافیت محسوس ہوئی۔ بلکہ ایک واقعہ تو میں بھول ہی نہیں سکتا۔ یہ ۵۷۔۵۸ء کی بات ہے کہ میں اجمل باغ' رحیم آباد (ضلع رحیم یار خان) میں سردار اجمل خان لغاری مرحوم کے پاس بیٹھا ہوا تھا کہ ایک ادھیڑ عمر کے مولوی صاحب تشریف لائے جن کی داڑھی اور سر دونوں کے بال نہایت پراگندہ' اور کپڑے نہایت میلے اور بوسیدہ تھے' چہرے پر خشونت بلکہ وحشت تک کے آثار تھے اور ہاتھ میں ایک بہت بھاری بھرکم عصا تھا۔ معلوم ہوا کہ یہ مولانا عبید اللہ سندھیؒ کے شاگرد اور مصاحب رہے تھے۔ (مجھے ان کا نام اس وقت یاد نہیں آ رہا۔ اگرچہ بہت بعد کی بات ہے کہ ایک بار جب جناح ہال لاہور میں قرآن کانفرنس کا ایک اجلاس ہو رہا تھا' یہ اچانک "وارد" ہو گئے تھے' اور انہیں میں نے ایک مختصر سے خطاب کا موقع بھی دیا تھا!) بہرحال وہ سردار اجمل خاں صاحب مرحوم سے گفتگو کرتے رہے اور میں صرف سنتا رہا۔ لیکن اثنائے گفتگو میں ایک بار ان کی زبان پر "مولوی انیس احمد" کا نام ایسے غیظ و غضب کے ساتھ آیا کہ مجھے محسوس ہوا کہ اگر انہیں یہ معلوم ہو جائے کہ میں ان کا رشتہ کا بھانجا ہوں تو چشم زدن میں ان کا بھاری بھرکم عصا میرے سر پر ہو گا!

اس کے چند سالوں کے بعد مولوی انیس احمد صاحب کے ایک بھتیجے سے تعارف ہوا۔ یہ شکیل احمد قریشی مرحوم تھے' محکمہ انہار میں سپرنٹنڈنگ انجینئر' اور اس اعتبار سے نہایت مشہور اور معروف کہ گہری دینداری کے ساتھ ساتھ پورے "دیانتدار" بھی تھے اور اس

پر مستزاد یہ کہ نہایت دبنگ افسر بھی تھے اور اپنے کام میں ماہر بھی! (یہ موجودہ ماحول کے اعتبار سے "متضاد" اوصاف کسی ایک انسان میں شاذ ہی جمع ہوتے ہیں)۔ ان کے بارے میں جب یہ معلوم ہوا کہ وہ مولانا احمد علی لاہوریؒ سے بیعت ہیں تو حیرت ہوئی کہ جس حلقے کے لوگ ان کے تایا اور دادا کو انگریز کے ایجنٹ اور قوم کے غدار قرار دیتے ہیں اسی کے ایک بزرگ سے یہ کیسے بیعت ہو گئے!

تاہم اس پوری صورتحال کا "ڈراپ سین" اس صورت میں ہوا کہ جب میں ۱۹۸۰ء میں پہلی بار "بھارت" گیا اور لکھنؤ میں مولانا محمد منظور نعمانیؒ سے ملاقات ہوئی تو چونکہ ان کا قیام بھی بہت طویل زمانے تک بریلی میں رہا تھا جہاں مولوی انیس احمد صاحب کے والد خان بہادر مولوی ادریس احمد مرحوم محکمہ تعلیم میں بہت اونچے منصب پر فائز رہے تھے (اس صدی کی تیسری دہائی کے دور میں ان کی تنخواہ ایک ہزار روپے ماہانہ سے متجاوز تھی) تو میں نے مولانا نعمانیؒ سے ڈرتے ڈرتے مولوی ادریس صاحب کے بارے میں دریافت کر لیا۔ اس پر مولانا نے بتایا کہ ان کے ساتھ ان کی گہری شناسائی تھی اور گھریلو مراسم بھی رہے تھے اور یہ کہ کچھ لوگوں نے ان کے بیٹے مولوی انیس احمد کو خواہ مخواہ بدنام کیا، حالانکہ اب جو انڈیا آفس کا ریکارڈ منظرعام پر آیا ہے اس سے تو معلوم ہوا ہے کہ مولوی صاحب مرحوم نہایت مخلص اور جوشیلے انقلابی کارکن تھے اور انگریز انہیں شیخ الہندؒ کے "خطرناک ترین" فدائیوں میں شمار کرتے تھے۔ اس پر میرے دل کا بوجھ ہلکا ہوا۔ اور میں نے اللہ کا شکر ادا کیا کہ میرے رشتے کے ماموں بفضلہٖ تعالیٰ نہ غدار تھے نہ سرکار انگریزی کے مخبر، بلکہ مخلص مومن اور مرد مجاہد تھے۔

اس کے چند سال بعد کراچی میں انیس احمدؒ صاحب کے فرزند شاہد احمد (مرحوم) سے ملاقات ہوئی (جو ایک دوسرے رشتے سے میرے خالو بھی تھے!) تو مزید معلومات حاصل ہوئیں جن سے کچھ احساس فخر بھی پیدا ہوا۔۔۔ خصوصاً اس بات سے کہ مولوی انیس احمدؒ بھی ان چند خوش قسمت نوجوانوں میں سے تھے جنہوں نے گریجویشن کے بعد فتح پوری مسجد دہلی میں قائم شدہ "ادارۂ نظارۃ المعارف" میں مولانا عبید اللہ سندھیؒ ایسے انقلابی انسان سے قرآن پڑھا تھا اور ان ہی کی وساطت سے حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ کی مشہور

تحریک آزادی موسوم بہ "تحریک ریشمی رومال" میں شرکت کر کے قید و بند کی صعوبتیں برداشت کی تھیں!

البتہ جہاں تک ان کے والد مرحوم اور میری والدہ مرحومہ کے حقیقی پھوپھا یعنی خان بہادر مولوی ادریس احمد صاحب کا تعلق ہے وہ یقیناً سر سید مرحوم کے مکتب فکر سے تعلق رکھتے تھے اور مسلمانانِ ہند کی مصلحت اس میں سمجھتے تھے کہ انگریزی حکومت کے خلاف بغاوت کی روش کو ترک کر کے مصالحت کا رویہ اختیار کیا جائے، اور انگریزی زبان بھی پڑھی جائے اور جدید علوم کی بھی بھرپور طور پر تحصیل کی جائے۔ چنانچہ یہ حقیقت ان کے نام کے ساتھ ملحق خطاب سے بھی ظاہر ہے۔ تاہم ایک تو یہ ایک خاص دور کی بات ہے جس میں بہت سے عظیم المرتبت علماء بھی اس رائے کے حامل تھے۔ (جیسے مولانا اشرف علی تھانوی، مولانا احمد رضا خاں بریلوی اور مولانا محمد حسین بٹالوی رحمہم اللہ!) اور دوسرے یہ کہ ایسا تو بارہا ہوا ہے کہ بیٹے نے باپ کی رائے اور روش کے بالکل برعکس راستہ اختیار کر لیا اور آزر کے گھر میں ابراہیمؑ پیدا ہو گئے۔ چنانچہ یہی صورت اس معاملے میں ہوئی!

بہرحال، اپنی اسی ملاقات میں جناب شاہد احمد صاحب نے مجھے اپنے والد مرحوم کی پیش نظر تالیف "انوار القرآن" کا ایک نہایت بوسیدہ نسخہ اپنے تحریر کردہ "تعارف" کے ساتھ عنایت فرمایا تھا جسے ایک "تبرکِ علمی" کی حیثیت سے شائع کرنے کا فیصلہ تو اگرچہ میں نے اسی وقت کر لیا تھا، تاہم دیگر دعوتی و تنظیمی مصروفیات کی وجہ سے، جن میں گزشتہ دس پندرہ سالوں کے دوران بیرونی اسفار نے زیادہ ہی شدت پیدا کر دی ہے، یہ کام مؤخر ہوتا رہا۔ تاآنکہ "کُلّ امرٍ مرھونٌ لوقتہٖ" کے مطابق مشیتِ ایزدی میں اس کی اشاعت کا وقت آ گیا۔ چنانچہ اب یہ قارئین کی خدمت میں پیش ہے۔

اس موقع پر مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اپنی اس تحریر کا اقتباس بھی پیش کر دوں جو میں نے ۱۹۸۷ء میں مولانا عبید اللہ سندھیؒ کے ایک دوسرے شاگرد خواجہ عبد الحیٔ فاروقیؒ کی تالیف "الخلافۃ الکبرٰی" کا مقدمہ ماہنامہ "میثاق" میں شائع کرتے ہوئے اس کے تعارف کے ضمن میں سپردِ قلم کی تھی:

"اس تبرکِ علمی و دینی کے تعارف کا ایک دوسرا رخ بھی ضروری ہے اور وہ یہ کہ اس کا تعلق علم و تفسیرِ قرآن کے اس "انقلابی" مزاج کے حامل سلسلے سے ہے جو اس صدی کے اوائل میں حضرت شیخ الہند مولانا محمود الحسن دیوبندیؒ کی ذاتِ بابرکات سے شروع ہوا تھا' جن کے خلیفۂ اول کی حیثیت حاصل تھی مولانا عبیداللہ سندھیؒ کو جو اواخر عمر میں کچھ زیادہ ہی "انقلابی" ہو گئے تھے' اور خلیفۂ ثانی کا درجہ حاصل تھا مولانا احمد علی لاہوریؒ کو جو عمر کے آخری دور میں اغلباً اعوان و انصار کی کمی اور حالات کے ہاتھوں مجبور ہو کر انقلابیت سے کسی قدر رجعت فرما کر روحانیت اور بیعتِ ارشاد میں منہمک ہو گئے تھے اور تیسری اہم شخصیت تھی خواجہ عبدالحیٔ فاروقیؒ کی جو اغلباً از اول تا آخر معتدل مزاج کے حامل رہے اور ان کے انقلابی فکرِ قرآنی نے نہ تو کوئی بڑی زقند لگائی اور نہ کسی درجے میں رجعت ہی اختیار کی!

راقم نے آج سے ٹھیک دو سال قبل "میثاق" بابت دسمبر ۱۹۷۶ء میں ایک طویل مضمون میں تفسیرِ قرآن کی ان مختلف شاخوں کا جائزہ لیا تھا جو برعظیم پاک و ہند میں انیسویں صدی عیسوی کے اواخر اور بیسویں صدی کے اوائل میں پھلی پھولیں۔ (یہ تحریر اب راقم کی تالیف "دعوت رجوع الی القرآن کا منظر و پس منظر" میں شامل ہے!) ان میں قادیانی و لاہوری سلسلے سے قطع نظر جو "ضَلَّ ضَلَالًا بَعِيدًا" کا مصداقِ کامل بن گیا' ایک انتہا پر تو متجددین کا سلسلہ تھا جس کے بانی مبانی تھے سرسید مرحوم اور ان کے اہم خلفاء میں شامل ہیں علامہ عنایت اللہ خان مشرقی اور چوہدری غلام احمد پرویز' اور دوسری انتہا پر تھے "الرَّاسِخُونَ فِي الْعِلْمِ" جن کے سید الطائفہ تھے حضرت شیخ الہندؒ۔ اور ان کے مابین تھیں تین درمیانی رنگ کی حامل شاخیں جو..... مولانا ابوالکلام آزاد' مولانا حمید الدین فراہی اور علامہ اقبال سے شروع ہوئیں اور جن کے خلفاءِ عظام ہیں علی الترتیب مولانا مودودی' مولانا اصلاحی اور ڈاکٹر رفیع الدین۔ علماءِ راسخین کے حلقے کی دوسری اہم شخصیت ہیں مولانا شاہ اشرف علی تھانویؒ جن کے بارے میں راقم لکھ چکا ہے کہ ان کی تفسیر بیان القرآن سے تین تفسیریں مزید نکلی ہیں' ایک مولانا عبدالماجد دریابادی مرحوم کی' دوسری مولانا محمد ادریس کاندھلویؒ کی اور تیسری مفتی محمد شفیعؒ کی۔ البتہ خاص حضرت شیخ الہندؒ کی ذاتِ بابرکات سے تفسیر قرآن کے جو دو چشمے پھوٹے ان میں سے متذکرہ بالا تحریر میں صرف ایک کا ذکر ہوا تھا

یعنی مولانا شبیر احمد عثمانیؒ کے حد درجہ سلیس لیکن انتہائی عمیق حواشی کا۔ لیکن دوسرے اہم سلسلے کا ذکر رہ گیا تھا جس کے اہم افراد ہیں مولانا عبیداللہ سندھی مرحوم' مولانا احمد علی لاہوریؒ اور خواجہ عبدالحیؒ فاروقیؒ۔"

پیش نظر کتاب کی اشاعت کے ذریعے' ان شاء اللہ العزیز' اس "سلسلة الذهب" کی ایک تیسری کڑی کا ذکر بھی تاریخ کے صفحات میں مذکور و محفوظ ہو جائے گا۔

مولوی انیس احمدؒ کے بڑے بیٹے نفیس احمد مرحوم تو میری معلومات کی حد تک لاولد ہی فوت ہو گئے تھے۔ البتہ ان کے چھوٹے بیٹے شاہد احمد مرحوم کی اولاد بحمد اللہ پاکستان میں موجود ہے اور سب بہن بھائی بحمد اللہ ذہانت و فطانت میں تو اپنے اسلاف کی روایات کو قائم رکھے ہوئے ہیں۔ دعا ہے کہ اللہ ان سب کو اپنے جدِّ امجد کے نقش قدم پر چلنے کی توفیق بھی عطا فرمائے۔ آمین!

خاکسار اسرار احمد عفی عنہ
لاہور' ۵۔ جون ۱۹۹۶ء

رشتہ درکار ہے

تعلیم میٹرک معہ ایک سالہ ٹیکنیکل ڈپلومہ کے حامل لڑکے کے لئے تعلیم یافتہ لڑکی کا رشتہ درکار ہے۔ دینی مزاج کے تعلیم یافتہ والدین / سرپرست رجوع فرمائیں۔ ایسے خاندان کو جو اندرون ملک یا بیرون ملک روزگار کے بہتر مواقع میں معاونت فرما سکیں' ترجیح دی جائے گی۔

رابطہ : ڈاکٹر ا۔ن۔ک

707, 1-104/4 Sub.Str. 102, Islamabad 44790

مولوی انیس احمدؒ کی کتاب "انوار القرآن" کا تعارف

یہ کتاب "انوار القرآن" والد صاحب مرحوم و مغفور نے غالباً ۱۹۲۰ء یا ۱۹۲۱ء میں تصنیف کی۔ اس سے پہلے بھی ان کی دو کتابیں آرٹ پیپر پر شائع ہوئیں جن کے نام تھے "تعلیم القرآن" اور "کلیدِ قرآن"۔ آخر الذکر کتاب انہوں نے دوبارہ شائع کرنے کے لئے شیخ محمد اشرف صاحب کو دی تھی جو لاہور کے بڑے پبلشر ہیں۔ لیکن چونکہ مولانا موصوف پر انگریز دشمنی کا لیبل لگا ہوا تھا لہٰذا انہوں نے اس کو شائع نہیں کیا۔ اس کی آخری کاپی ضرور ان کے مطبع کے ریکارڈ میں ہوگی۔

والد صاحب مرحوم بڑے روشن خیال عالم تھے اور بڑے پکے موحد اور مجاہد۔ انہوں نے دنیاوی منفعت اور آسائش کو کبھی کوئی حیثیت نہیں دی۔ جہاں تک مجھے ان سے معلوم ہوا وہ یہ تھا کہ ۱۹۱۲ء میں جب ایم اے او کالج علی گڑھ سے انہوں نے بی اے بڑے امتیاز سے پاس کیا تو ان کو ڈپٹی کلکٹری کا پروانہ انگریزوں نے عطا کیا۔ لیکن ان کو جذبۂ دینی اور جذبۂ جہاد نے گھر سے جانے پر مجبور کیا۔ اُس وقت تک ان کی تین اولادیں ہو چکی تھیں۔ ان کی والدہ محترمہ نے ان کو زادِ راہ کے لئے اپنا سارا زیور دے دیا اور وہ خاموشی سے دہلی چلے گئے۔ وہاں مولانا عبید اللہ سندھی صاحب نے ادارۂ نظارۃ المعارف فتح پوری مسجد میں بنایا تھا جہاں وہ صرف گریجویٹ طلبہ کو قرآن کی تعلیم دیتے تھے۔ وہاں سے بہت جلد وہ فارغ ہوئے اور مولانا عبید اللہ نے اپنی خصوصی سند کے ساتھ حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ کے پاس دیوبند بھیج دیا۔ حضرت شیخ الہند نے ایک سال سے کم عرصے میں ان کو سندِ تبلیغِ قرآن اور علومِ دین عطا فرمائی۔

حضرت موصوف کی تحریک جہاد، جسے انگریز ریشمی رومال کی سازش یا بغاوت کہتے ہیں، شروع ہوئی تو وہ اولین ساتھیوں میں سے تھے۔ تحریک کی تنظیم حیدر آباد دکن ان کے سپرد ہوئی۔ افغانستان میں انگریزوں کے سفیر کو جب حبیب اللہ خان نے حضرت شیخ الہند کی

تحریک کی دستاویزات دے دیں تو جو لوگ تحریک میں شامل تھے ان کے نام انگریزی حکومت کو معلوم ہو گئے اور حضرت والد صاحب کو حیدر آباد میں گرفتار کر کے دیگر قیدیوں کے ساتھ آہنی پنجروں میں ہر قسم کے لباس سے معرار نگون بھیج دیا گیا۔

رنگون جانے سے پہلے جب وہ جنگی قیدیوں کی کار میں جامع مسجد دہلی کے قریب سے گزرے تو انہوں نے محافظوں سے اجازت لے کر حضرت باقی باللہ رحمتہ اللہ علیہ کے مزار پر فاتحہ پڑھ کر یہ دعا مانگی کہ ان کو مجاہد کی موت نصیب ہو' جو قبول ہوئی اور میں اس کا گواہ ہوں۔

ان کے والد یعنی ہمارے دادا صاحب مرحوم خان بہادر مولوی ادریس احمد صاحب کا انگریزوں میں بڑا نام تھا۔ انہوں نے اُس وقت کے وائسرائے سے والد صاحب مرحوم کی رہائی کی درخواست کی۔ والد صاحب مرحوم نے یہ شرط لگائی کہ ان کے مرشد حضرت شیخ الہند سے اجازت لی جائے۔ چنانچہ جب ان کی اجازت آئی تو وہ انگریزوں کی قید سے اپنے والد مرحوم کی نظربندی میں آ گئے۔ جنگ عظیم اول کے فوراً بعد ان کی نظربندی ختم ہوئی۔ ان کا فرمانا تھا کہ انہی دنوں میں یا جس دن رہائی کا حکم آیا تھا میری پیدائش کی اطلاع ان کو ملی۔

اس کے بعد ۱۹۴۷ء تک ان کی زندگی کشاکشِ حیات اور ابتلا میں گزری۔ انہوں نے اپنی درویشانہ منش نہیں چھوڑی اور نہ اپنے ضمیر کا سودا کیا۔ دیوبند کے علماء سے ان کا کوئی تعلق نہیں تھا' نہ وہ کانگرسی مولویوں کے ہم خیال تھے۔ انہوں نے انگریزوں سے بھی کوئی تعلق نہیں رکھا۔ ان کو بہت بڑی بڑی ملازمتوں کی پیشکش ہوئی لیکن وہ صرف جرنلزم سے روپیہ کماتے تھے۔ میں نے الطاف حسین مرحوم کو' جو بعد میں وزیر ہوئے' ان کے شاگرد کی حیثیت سے دیکھا ہے۔

ان کی علمی وجاہت کی یہ شان تھی کہ خواجہ حسن نظامی جیسے لوگ ان سے عاجزانہ ملتے تھے۔ علامہ مشرقی' شاعر مشرق علامہ اقبال' اکبر الٰہ آبادی' سر عبدالقادر' غرض اس زمانہ کے سب بڑے لیڈر ان سے مشورہ کرنے کو اعزاز سمجھتے تھے۔ ہندوستانی ریاستوں کے تمام مسلمان حکمران بھی ان سے ذاتی طور پر واقف تھے اور ان کا ادب کرتے تھے۔

انگریزوں نے ہر طرح انکو نقصان پہنچایا۔ یہاں تک کہ جب میں نے مقابلہ کے امتحانوں میں بیٹھنا چاہاتو مجھے اجازت نہیں ملی اور میں نے اپیل کی تو اجازت ملی۔ اس میں میرا ایک سال ضائع ہو گیا۔

مسلم لیگ میں بھی وہ کبھی باقاعدہ شریک نہیں ہوئے' البتہ پاکستان کے تصور سے ان کو محبت تھی اور ۱۹۴۶ء کے آخر میں وہ پشاور آگئے تھے اور انہوں نے مالاکنڈ ایجنسی میں جہاد پر تقاریر کیں اور مضامین لکھے' جو سرحد کے تقریباً سب اخباروں میں اردو اور پشتو میں شائع ہوئے۔ انہی میں سے میں نے چند ایک کتابی صورت میں شائع کئے ہیں۔ یہی ایک خدمت ہے جو میں ان کی کر سکا ہوں۔

پاکستان بننے کے بعد ان کے قدیم دوستوں میں نواب زادہ لیاقت علی خان مرحوم' غلام محمد مرحوم اور جسٹس دین محمد مرحوم نمایاں تھے۔ غلام محمد صاحب جب گورنر جنرل ہوئے تو انہوں نے والد صاحب کو چار لاکھ روپے پیش کئے کہ اس سے ادارۂ ثقافت اسلامی بنائیں اور قرآن مجید کا ترجمہ کریں جس پر غلام محمد کی مہر ہو کہ ان کی تصدیق سے شائع ہوا' جیسے بائبل مہر پر ہوتی ہے۔ والد صاحب نے کسی اور بزرگ کا نام پیش کر دیا' کیونکہ وہ قرآن کی خدمت میں اس قسم کا معاوضہ یا کسی گورنر جنرل کے دستِ اعانت سے محفوظ رہنا چاہتے تھے۔ جسٹس دین محمد مرحوم نے ان کو حیدر آباد گورنمنٹ کالج میں دینی تعلیم کے کورس اساتذہ کو کرانے کے لئے لیکچرر مقرر کیا اور یہ کام انہوں نے تقریباً تین سال کیا۔ انہی دنوں میں انہوں نے کلام مجید کے پارہ عَمّ اور پھر پہلے ۹ پاروں کا سلیس اردو ترجمہ کیا جو جناب سعید بہاری مرحوم نے کئی لاکھ کی تعداد میں شائع کرا کر مفت تقسیم کیا۔ عالمِ نزع میں انہوں نے جو باتیں مجھ سے کیں ان سے معلوم ہوا کہ جتنی خدمت ان سے قرآن کی ہو گئی ہے اور جتنا جہاد اسلام کی خدمت میں انہوں نے کیا ہے اس سے وہ مطمئن ہیں۔

انہیں اندازہ ہو گیا تھا کہ اب دم واپسیں آگیا ہے' چنانچہ انہوں نے مجھے اپنے کمرہ سے باہر بھیج دیا اور اپنے خادمِ خاص سے جسم کو صاف کرایا اور پھر دو رکعت نماز پڑھی۔ اس کے بعد مجھے بلایا اور فرمایا کہ اب وہ آرام کرنا چاہتے ہیں۔ چادر انہوں نے خود اوڑھی اور منہ چادر میں کر لیا۔ میں نے دل میں یٰسین شریف پڑھنی شروع کی تو انہوں نے ایک دم منہ

باہر نکال کر پوچھا کہ کیا پڑھ رہے ہو؟ میں نے بتایا تو کہا کہ زور سے پڑھو۔ جب چار رکوع ہو گئے تو کہا کہ بس۔ اس کے فوراً بعد لیڈی نرس آئی۔ اس نے نبض دیکھی تو کہا کہ وہ انتقال کر چکے ہیں۔ اِنّا لِلّٰہ وَاِنّا اِلَیہ رَاجِعُون۔

ان کی پیدائش ستمبر ۱۸۹۰ء میں اور وفات ستمبر ۱۹۵۴ء میں ہوئی۔ اس طرح یہ مردِ مجاہد نفسِ مطمئنّہ کے ساتھ اپنے مقام موعود پر پہنچا۔

میں اس زمانہ میں لاہور میں کنٹرولر آف ملٹری اکاؤنٹس تھا اور اس حیثیت میں لیفٹیننٹ جنرل محمد اعظم خاں کا جو لاہور ڈویژن کی ملٹری کے کمانڈر تھے' مالی مشیر تھا۔ جنرل صاحب شرفاء نوازی کے لئے مشہور ہیں۔ ان کو جب معلوم ہوا کہ میرے والد صاحب آئے ہوئے ہیں اور بیمار ہیں تو ان کی مزاج پرسی کے لئے آئے۔ ان سے ملاقات کے بعد مجھ سے کہا کہ آپ کے والد تو مجاہد معلوم ہوتے ہیں۔ میں نے جنرل صاحب کی مردم شناسی کو سراہا۔ جنرل صاحب نے انہیں اپنا مہمان بنا لیا اور ان کا علاج ایسے ہی کیا جیسے کہ وہ اپنے والد کا کرتے۔ والد صاحب مرحوم نے ان سے فرمایا کہ آپ نے میرا ایسا اہتمام کیا ہے جیسا کسی صاحبِ تخت و تاج کا ہوتا ہے۔

ان کا جنازہ بھی فوجی اعزاز سے لے جایا گیا اور فوج کے اہتمام میں ان کی تدفین ہوئی۔

یہ وہ شخص تھا کہ زندگی میں اپنے کپڑے اپنے ہاتھ سے دھوتا تھا۔ کبھی قیمتی کپڑے نہیں پہنے۔ نہ کسی کی خوشامد کی' نہ کبھی کسی کی برائی کی۔ اگر کسی کی مدد کر سکے تو ضرور کی اور کبھی جتایا نہیں۔

اپنے اہل خانہ کو' جس قدر کماتے تھے' بھیجتے تھے' لیکن ہمارا گزارا نہیں ہوتا تھا۔ ہمارے دادا صاحب جب تک زندہ رہے وہ ہمیں ایک معقول رقم خرچ کے لئے بھیجتے تھے۔ ۱۹۳۵ء میں ان کا انتقال ہو گیا۔ اس کے بعد ہمارا وقت کافی تکلیف سے گزرا۔ بہرحال ہمیں اپنے باپ سے ایسا کیریکٹر ملا ہے کہ ہم بڑے سے بڑے ظالم سے پنجہ آزمائی کرنے کے لئے تیار رہتے ہیں۔ رزقِ حلال کھانے کی وجہ سے ہمیں کبھی دنیاوی فکر نہیں ہوئے اور ہر تکلیف پر اِنّا لِلّٰہ وَاِنّا اِلَیہ رَاجِعُون کہتے ہیں۔

ان کی طبعِ غیور کو یہ بھی گوارا نہ تھا کہ اپنی اولاد کا بھی احسان لیتے۔ مجھے ان کی زندگی

میں کافی بڑا عہدہ نصیب ہوا اور ان کی دعاؤں سے بڑی عزت و توقیر ملی' لیکن وہ کبھی ایک ہفتہ سے زیادہ میرے ہاں نہیں ٹھہرے۔ وہ بھی اس لئے کہ انہیں مجھ سے محبت تھی۔ ان کی آخری علالت جو میرے گھر میں ہوئی صرف چار دن تھی۔ لاہور آتے ہی انہوں نے مجھے دو ہزار روپے دے دیئے تھے۔ ان کے سفرِ آخرت کے لئے دنیاوی بندوبست کے لئے یہ کافی رقم تھی۔

یہ باتیں اس کے لئے لکھی گئی ہیں کہ لوگوں کو معلوم ہو سکے کہ اگر ان کا انگریزوں سے کوئی تعلق ہوتا اور حضرت شیخ الہند ؒ سے انہوں نے کوئی غداری کی ہوتی تو انہیں کوئی معاوضہ' کوئی عہدہ' کوئی اور انعام ملا ہوتا۔ انہوں نے تو دیوبندی اور کانگرسی مولویوں میں شامل ہونا بھی پسند نہیں کیا ورنہ کم ازکم کسی درگاہ یا دارالعلوم کے متولّی تو ہوتے۔ مسلم لیگ کافی عرصہ برسراقتدار رہی لیکن ان کی قلندری کا وہی حال رہا۔ البتہ جہاد کی جب ضرورت تھی انہوں نے اپنے مرشد کے ساتھ بھی کیا اور پھر پاکستان بننے سے پہلے سرحد کے غیور پٹھانوں میں جہاد کی روح پھونکی۔

البتہ وہ مردِ خدا تھے اور مردِ خدا کو صرف خدا اور رسول ﷺ کا دھیان رہتا ہے۔ اس معاملہ میں وہ ثابت قدم بھی رہتا ہے اور مطمئن بھی۔

خاکسار شاہد احمد
مورخہ ۸۵-۳-۱۸

بقیہ : تذکرہ و تبصرہ

کام کرنا چاہتی ہو تو کیا کہنا! بصورت دیگر میں تن تنہا اسی مقصد کے لئے کام کرتے رہنے ہی کو اصل کامیابی و سعادت و فلاح سمجھتا ہوں' چاہے پوری زندگی کی جدوجہد کے بعد بھی اس کا کوئی محسوس و مشہود نتیجہ سامنے نہ آئے۔"

۶۷-۶۸ء کے دوران محترم ڈاکٹر صاحب نے جو اداریئے تحریر کئے ان میں جہاں بعض نہایت اہم' خالص علمی اور دعوتی نوعیت کے موضوعات زیر بحث آئے' وہاں تحریک پاکستان کے تناظر میں قیام پاکستان کے بعد دینی جماعتوں بالخصوص دینی سیاسی جماعتوں کے طرز عمل کے بھرپور جائزے اور اس کے حوالے

سے کچھ اصولی مباحث پر مشتمل خالص تحریکی و سیاسی موضوعات پر بعض اداریئے بھی محترم ڈاکٹر صاحب کے قلم سے نکلے جو اب "اسلام اور پاکستان" کے نام سے ایک کتابی صورت میں دستیاب ہیں۔ اسی طرح دعوتی و فکری اعتبار سے محترم ڈاکٹر صاحب کی اہم ترین تحریریں جو اس دور میں ضبط تحریر میں آئیں وہ بھی اب کتابی صورت میں موجود ہیں۔ ان میں "اسلام کی نشاۃ ثانیہ : کرنے کا اصل کام" "مسلمانوں پر قرآن مجید کے حقوق" اور "راہ نجات: سورۃ العصر کی روشنی میں" کے نام قابل ذکر ہیں۔

۶۹۔۷۰ء کے دوران محترم ڈاکٹر صاحب نے جو اداریئے تحریر فرمائے وہ خالص سیاسی و قومی موضوعات پر تھے۔ ان میں ملک کے کرنٹ سیاسی حالات پر پر مغز تبصرے کے ساتھ ساتھ ملک میں موجودہ مختلف سیاسی جماعتوں کے پس منظر کے حوالے سے بھرپور تجزیہ نگاری بھی شامل تھی۔ یہ اداریئے علمی و سیاسی حلقوں میں بہت پسند کئے گئے۔ حال ہی میں میثاق کی مئی اور جون ۹۶ء کی اشاعتوں میں "تازہ خواہی داشتن" کے عنوان سے انہی اداریوں کو مکرر شائع کیا گیا تھا۔ ۷۰۔۷۱ء میں ملک کی سیاسی فضا جس تکدر کا شکار تھی اور سیاست کے میدان میں جو ہنگامہ آرائی تھی اس کا نہایت خوفناک نتیجہ سقوط مشرقی پاکستان کی صورت میں ظاہر ہوا۔ اس وقت جبکہ ملک کے نامور سیاسی تجزیہ نگار بھی حالات کی سنگینی کا ادراک کرنے اور آنے والے خطرے کی بو سونگھنے سے قاصر رہے بلکہ بعض چوٹی کے تجزیہ نگار "محبت کا زمزمہ بہہ رہا ہے" کی نوید سنا کر قوم کو حقائق سے چشم پوشی کا سبق دیتے رہے' محترم ڈاکٹر صاحب ۶۹۔۷۰ء کے دوران اپنے سیاسی تجزیوں میں نہ صرف حالات کی نزاکت و سنگینی سے قوم کو خبردار کرتے رہے بلکہ مسئلے کے ممکنہ حل یعنی مشرقی پاکستانی بھائیوں کو کامل صوبائی خود اختیاری دینے کا مشورہ بھی انہوں نے بلاخوف لومۃ لائم دیا' جس کا اس وقت کھلے الفاظ میں ذکر کرنا طنز و استہزاء کے تیروں کو دعوت دینے کے مترادف تھا' لیکن بعد کے حالات نے ثابت کیا کہ وہی صائب رائے تھی۔ ہم اگر اس وقت حقیقت پسندی کا ثبوت دیتے ہوئے وہ راستہ اختیار کر لیتے تو اس ذلت و رسوائی اور شکست و ہزیمت سے محفوظ رہتے جو بعد میں پاکستانی قوم کے حصے میں آئی ---- زیر نظر شمارے میں ۷۰۔۷۱ء کے مذکورہ اداریوں کے علاوہ ۷۲ء کا ایک اداریہ بھی جو سقوط مشرقی پاکستان کے فوراً بعد محترم ڈاکٹر صاحب نے سپرد قلم کیا تھا' شامل اشاعت کیا گیا ہے --- یوں سیاسی تجزیوں پر مشتمل "میثاق" کے سابقہ اداریوں کی اشاعت کا جو سلسلہ دو شمارے قبل شروع ہوا تھا' زیر نظر شمارے میں وہ اپنے اختتام کو پہنچ گیا ہے۔ اب ان شاء اللہ بہت جلد ان سب کو یکجا کتابی صورت میں شائع کر دیا جائے گا۔

عاکف سعید

حیاتِ اقبال کا ایک گم شدہ ورق

امارت اور بیعت کی اساس پر خالص دینی تنظیم کے قیام کی کوشش

(۲)

اُدھر علی گڑھ میں ڈاکٹر سید ظفر الحسن 'حضرت علامہ اقبال کے افکار سے متأثر ہو کر ۳۳-۱۹۳۲ء میں جماعت مجاہدین علی گڑھ کے نام سے بیعت اور امارت کی بنیاد پر فداکاروں پر مشتمل ایک اصولی انقلابی جماعت کی داغ بیل ڈال چکے تھے اور حضرت علامہ کی جانب سے اس کام کی مکمل اور بھرپور تائید سے حوصلہ پا کر نہ صرف یہ کہ اسے زیادہ بھرپور انداز میں آگے بڑھانے اور وسعت دینے کے شدید آرزومند تھے بلکہ اس بات کے بھی شدت کے ساتھ متمنی تھے کہ خود حضرت علامہ اس جماعت کی امارت کی ذمہ داری سنبھالیں تاکہ ان کی قیادت اور رہنمائی میں مسلمانانِ ہند اپنے اصل ہدف یعنی "اسلامی اصول پر حکومت قائم کرنے" کی جانب مؤثر انداز میں پیش قدمی کر سکیں 'اِدھر لاہور میں حضرت علامہ کے ایک اور عقیدت مند خواجہ عبدالوحید نے ۱۹۳۴ء کے لگ بھگ براہ راست حضرت علامہ کی رہنمائی میں "جمعیت شبان المسلمین" کے نام سے اسی طرز کی ایک جماعت کی تاسیس کی کوشش کا آغاز کر دیا۔ اس جماعت کی ضرورت و اہمیت کی وضاحت اور اس کے نقشہ کار پر مشتمل جو ابتدائی دستاویز مرتب کی گئی وہ اس دستاویز سے بہت مشابہ تھی جو ڈاکٹر سید ظفر الحسن صاحب نے جماعت مجاہدین علی گڑھ کے ابتدائی خاکے کے طور پر مرتب کی تھی {۱}۔ ڈاکٹر سید ظفر الحسن کے نام حضرت علامہ نے ۷ اجنوری ۳۵ء کو جو خط تحریر فرمایا تھا اس کے ان الفاظ میں کہ "شاید خواجہ عبدالوحید صاحب نے آپ کو لکھا ہو گا'

{۱} تفصیل کے لئے دیکھئے ڈاکٹر برہان احمد فاروقی کی کتاب 'علامہ اقبال اور مسلمانوں کا سیاسی نصب العین' ص ۳۵ تا ۳۸

یہاں کے لوگوں نے بھی تجویز کا گرم جوشی سے خیر مقدم کیا ہے' اگر کوئی اچھی جمعیت پیدا ہو گئی تو میں آپ کو اور میر صاحب کو چند گھنٹوں کے لئے لاہور آنے کی تکلیف دوں گا" اسی جانب اشارہ ہے۔ ان الفاظ کے بین السطور میں صاف پڑھا جا سکتا ہے کہ "جمعیت شبان المسلمین" کے قیام کی تجویز کو حضرت علامہ کی نہ صرف مکمل حمایت حاصل تھی بلکہ اس کے لئے تفصیلی نقشہ کار بھی علامہ کی براہ راست رہنمائی میں مرتب کیا گیا تھا۔ چنانچہ اس کے بارے میں ڈاکٹر برہان احمد فاروقی لکھتے ہیں :

> "علامہ اقبال نے اپنے مکتوب گرامی مورخہ ۱۷/ جنوری ۳۵ء میں خواجہ عبدالوحید صاحب کی جس تحریر کی طرف اشارہ کیا ہے وہ علامہ اقبال ہی کے ایماء سے جمعیت شبان المسلمین ہند کے نام سے ایک وسیع کارکن جماعت کے قیام کی ضرورت کے پیش نظر لکھی گئی تھی اور اس میں اس جماعت کے قیام کے لئے تائید طلب کی گئی تھی"۔
>
> (علامہ اقبال اور مسلمانوں کا سیاسی نصب العین' ص ۳۵)

جماعت مجاہدین علی گڑھ کے دستور کی مانند اس تحریر یا دستاویز میں بھی ایک اصولی اسلامی جماعت کا مکمل خاکہ موجود ہے۔ اس تحریر کے درج ذیل اقتباسات کو توجہ سے پڑھئے :

> "قوم کی شیرازہ بندی اس وقت تک نہیں ہو سکتی جب تک کہ افرادِ قوم کسی ایک فرد واحد کی زیر قیادت مصروف عمل ہونا گوارا نہ کریں۔ یہی چیز تھی جس کی طرف ارکان اسلام میں سے اہم ترین رکن' نماز مسلمانوں کو لے جانا چاہتی ہے۔ کسی قوم کی تمام عملی زندگی کا خلاصہ ان ہی تین لفظوں "جماعت" "امارت" اور "اطاعت" میں بیان کیا جا سکتا ہے اور جب تک یہ تینوں چیزیں کوئی قوم اپنے اندر پیدا نہ کرے اس وقت تک وہ قوم کہلانے کی مستحق نہیں ہو سکتی۔"
>
> "... آج مسلمانوں کی دنیوی اور اخروی نجات کے لئے وقت کی سب سے بڑی ضرورت ایک ایسی جماعت کا قیام ہے جس کے افراد ایک طرف آپس میں اخوت و اتحاد اور اشتراک عمل کا بہترین نمونہ اور دوسری طرف ایک امیر کی کامل اطاعت کا عملی ثبوت پیش کر سکیں۔"

مقام غور ہے کہ مندرجہ بالا اقتباسات مغربی طرز کی جمہوری جماعت پر منطبق ہوتے ہیں یا ایک اصولی اسلامی جماعت کی بہترین عکاسی پر مشتمل ہیں؟ یہ علامہ اقبال کی واقعیت پسندی کا بہت بڑا مظہر ہے کہ ریاست کی سطح پر جمہوری اقدار کے بہت بڑے حامی ہونے کے باوجود اور اس امر کے باوصف کہ وہ "ری پبلکن" طرز حکومت کو عصرِ حاضر کا ایک اہم تقاضا ہی نہیں اسلامی تعلیمات کے عین مطابق گردانتے ہیں' "اصولی اسلامی حکومت کے قیام" اور "اعلاء کلمتہ اللہ" کے لئے قائم ہونے والی جماعت کے بارے میں ان کا ذہن بالکل واضح تھا کہ ایسی جماعت کا قیام نہ صرف یہ کہ ایک ناگزیر ضرورت ہے بلکہ وہ جماعت یقینی طور پر امارت اور بیعت کی بنیاد پر ہی استوار کی جاسکتی ہے۔ لیکن آج علامہ کے خوانِ علم و دانش سے استخواں چننے والے بعض دانشور ایسی جماعت کے قیام کی ضرورت و اہمیت ہی کے سرے سے منکر ہو گئے ہیں اور امارت اور بیعت کے الفاظ تو ان کے نزدیک گالی سے کم نہیں!!! یہ نتیجہ ہے اس "فکری توازن" کے فقدان کا جو حضرت علامہ کا طرۂ امتیاز تھا۔ یہ امر واقعہ ہے کہ جو لوگ "عقل" کو اپنے اوپر حاوی کر کے عقل کی غلامی {۲} اختیار کر لیتے ہیں اور اسے "چراغ راہ" سمجھنے کی بجائے "منزل" {۳} قرار دے بیٹھتے ہیں وہ اسی نوع کے عدم توازن کا شکار ہو جاتے ہیں۔

ایک اصولی انقلابی جماعت کے امیر کو کن صفات کا حامل ہونا چاہئے' اس بارے میں اس دستاویز میں شامل درج ذیل پیراگراف اس کے مرتبین کے فکری اعتدال اور فہم و بصیرت کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ آپ بھی پڑھئے!

> "مجوزہ جماعت کا امیر کسی ایسے بزرگ کو منتخب کرنا چاہئے جو ایک طرف تعلیم و تمدن اور تاریخ اسلام کا بہترین سمجھنے والا ہو اور دوسری طرف مغرب کی سیاسی چالبازیوں اور علمی بلند پروازیوں سے بھی پورا واقف ہو۔ جس کے دل میں قوم و ملت کا درد بھی موجود ہو اور جس کی ذات سے ایثار اور جاں فروشی کی توقع بھی ہو

{۲} "صبح ازل یہ مجھ سے کہا جبرئیل نے ۔ جو عقل کا غلام ہو وہ دل نہ کر قبول (اقبال)

{۳} گزر جا عقل سے آگے کہ یہ نور ۔ چراغ راہ ہے منزل نہیں ہے (اقبال)

سکتی ہو۔ جس کا ایمان سلاطین زماں کے دبدبے اور شوکت سے متزلزل نہ ہو سکے اور جس کے عزائم میں غیر ہمدرد حکومتوں کا جبر و قہر کمزوری پیدا نہ کر سکے۔ جس کے خزانہ معلومات میں مشرق و مغرب کے اخبار حکم موجود ہوں اور جس کے تدبر و تفکر کی قرآن و سنت سے تصدیق ہوتی ہو۔ جب ایسا رہنما ایک جماعت کے ہاتھ آ جائے تو اس کے افراد بلا خوف و خطر اپنے آپ کو اس کے سپرد کر دیں۔"

تنظیمی ہیئت اور جماعتی ساخت کے اعتبار سے تنظیم اسلامی کا جمعیت شبان المسلمین ہند سے مماثل و مشابہ ہونا تو بالکل واضح ہے ہی' انتخابی سیاست میں حصہ لینے یا نہ لینے اور قومی سیاسی امور پر اظہار رائے کرنے یا اس پر سکوت اختیار کرنے کے مسئلے میں بھی جمعیت شبان المسلمین ہند کی پالیسی نہایت حقیقت پسندانہ اور تنظیم اسلامی کی پالیسی سے پورے طور پر مشابہ اور ہم آہنگ تھی۔ اسی دستاویز کا درج ذیل اقتباس ملاحظہ ہو!

"... یہ جمعیت سردست کوئی سیاسی پارٹی نہ ہوگی اور نہ کونسلوں اور اسمبلی کے لئے امیدوار کھڑے کرے گی۔ مگر چونکہ قوموں کی اجتماعی حیات پر سیاسیات کا ایک گہرا اثر پڑتا ہے' اس لئے یہ جماعت ان تمام سیاسی امور میں مسلمانان ہند کی اجتماعی زندگی پر مؤثر ہونے کے لئے حسب تقاضائے وقت مسلمانوں کے سیاسی افکار کی تربیت کے لئے اپنی رائے کا اظہار کرتی رہے گی۔ اس طرح گو فی الحال اس جماعت کو سیاسیات میں عملی اقدام سے کوئی سروکار نہ ہو گا لیکن امیر جماعت کو اختیار ہو گا کہ بوقت ضرورت جماعت کو ایسے مقاصد کے لئے بھی تیار کرے۔"

اسی طرح جمعیت کے مجوزہ دستور میں امیر اور اس کے اختیارات کی تفصیل جن الفاظ میں درج کی گئی ہے ان سے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ حضرت علامہ اور ان کے قریبی ساتھی ایک اصولی اسلامی انقلابی جماعت کے تقاضوں سے بخوبی باخبر اور اسلام کے تصورِ امارت کا صحیح ادراک رکھتے تھے۔ ملاحظہ ہو :

"پہلا امیر تاحیات امیر رہے گا۔
امیر کو اختیاراتِ کلی حاصل ہوں گے۔
امیر کے لئے لازم ہو گا کہ وہ ارکان اسلام کا پابند ہو اور سادہ زندگی بسر کرے۔

امیر مجلس شوریٰ کے فیصلوں کی پابندی پر مجبور نہ ہو گا بلکہ ہر معاملے میں حکم ہو گا۔"

جماعت کے اندر مشورہ و مشاورت کی فضا کو برقرار رکھنے کی خاطر امیر کے بارے میں طے کیا گیا کہ وہ مجلس عاملہ کے اجلاس میں ایک عہد نامہ پر دستخط کرے گا جس میں یہ الفاظ بھی شامل ہوں گے :

"میں حتی الامکان ہر معاملے میں مجلس مشاورت کے مشورے سے کام کروں گا"۔

تاہم اس کے فوراً بعد دستور میں یہ صراحت بھی موجود ہے جو آج کے جمہوریت پسندوں کو بہت کھٹکے گی :

"امیر مجلس مشاورت کے مشورے اور مجلس تنفیذیہ کی وساطت کے بغیر احکام صادر کر سکتا ہے۔"

(علامہ اقبال اور مسلمانوں کا سیاسی نصب العین۔ ص ۴۴)

اسی طرح ارکان جماعت کے لئے جو عہد نامہ مرتّب کیا گیا اس کے الفاظ بھی اس امر کا واضح طور پر پتہ دیتے ہیں کہ یہ ایک ٹھیٹھ اسلامی جماعت تھی جس کا قیام "اعلاء کلمتہ اللہ" کے لئے عمل میں آیا تھا۔ اس عہد نامہ کے چیدہ چیدہ نکات درج ذیل ہیں۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ گویا تنظیم اسلامی کے دستور العمل ہی کو قدرے مختلف الفاظ میں پیش کیا گیا ہے :

"○ میں اعلائے کلمتہ اللہ اور ہندوستان میں مسلمانوں کی بہتری کے لئے اپنی جان مال' آسائش اور جاہ ہر چیز قربان کرنے کے لئے ہمیشہ تیار اور آمادہ رہوں گا۔
○ ارکان اسلام اور اخلاق صالحہ کی پابندی کی پوری کوشش کروں گا۔
○ جماعت کے اجتماعات میں شامل ہوا کروں گا۔
○ جماعت کا اخبار باقاعدہ پڑھتا رہوں گا۔
○ کسی سیاسی جماعت میں بغیر اجازت امیر کے شامل نہ ہوں گا۔
○ اسلام کی تعلیم' تاریخ اور تمدن کا مطالعہ کروں گا۔
○ غیر ضروری اور خلاف شریعت' مخرب اخلاق رسومات سے پرہیز کروں گا۔
○ امیر جماعت کے احکامُ (بالواسطہ یا بلاواسطہ) پر بے چون وچرا عمل کروں گا۔

○ میں اپنے بچوں (لڑکوں اور لڑکیوں) کے تعلیم و تربیت صحیح اسلامی اصول کے مطابق کروں گا۔

○ میں ہر قسم کے صدقات جمعیت کے بیت المال میں جمع کروں گا۔"

مجلس تنفیذیہ یا جسے آج کی اصطلاح میں مجلس عاملہ کہا جاتا ہے، کے بارے میں درج ذیل امور دستور میں طے کئے گئے :

"○ اس مجلس کے تمام ارکان کا انتخاب امیر کرے گا۔

○ یہ مجلس، مجلس شوریٰ اور مجلس عامہ کے فیصلوں پر عمل در آمد کرائے گی۔

○ تعداد ارکان سات ہوگی۔

○ کورم تین کا ہوگا۔

○ مجلس کا انتخاب سالانہ ہوگا۔"

اسی طرح مجلس شوریٰ کے انتخاب اور اس سے متعلق دیگر اہم معاملات کے بارے میں جو امور طے پائے ان میں بھی مجلس تنفیذیہ کے انتخاب کی مانند "امیر" کو غیر معمولی اختیارات دیئے گئے ہیں۔ ملاحظہ کیجئے :

"۱۔ اس مجلس کے بیس ارکان ہوں گے۔

۲۔ دس ارکان کا انتخاب امیر کرے گا۔

۳۔ دس ارکان کا انتخاب مجلس عامہ کرے گی۔

۴۔ کورم سات کا ہوگا۔

۵۔ مجلس کا انتخاب سالانہ ہوگا۔

۶۔ یہ مجلس امیر کے حسب منشا جمع ہو کر جماعت کے کاروبار کے متعلق مشورہ دے گی۔"

مالیات کے ضمن میں یہ طے پایا کہ ہر رکن جمعیت ہر ماہ کم از کم چار آنے جمعیت کے خزانے میں داخل کرے گا۔ یاد رہے کہ اس دور کے چار آنے قدر و قیمت کے لحاظ سے کم و بیش آج کے ۱۰۰ روپوں کے مساوی تو ضرور رہوں گے.....

جمعیت کی مجلس عامہ اور سالانہ اجلاس عام کے بارے میں جو امور طے کئے گئے وہ

بھی یقیناً قارئین اور بالخصوص رفقائے تنظیم اسلامی کی دلچسپی کا موجب ہوں گے :

"ا۔ جماعت کا ہر رکن مجلس عامہ کا رکن ہو گا۔

۲۔ یہ جماعت سال میں ایک بار لاہور میں اپنا اجلاس عام کرے گی۔

۳۔ سالانہ اجلاس لاہور کے علاوہ اور شہروں میں بھی ہو سکتا ہے۔"

یہ دستور بعض اعتبارات سے تشنہ محسوس ہوتا ہے' بالخصوص یہ اہم مسئلہ کہ جماعت کے اندر اظہارِ رائے کے چینلز کون کون سے ہوں گے' مشاورت کا تفصیلی نظام کیا ہو گا اور اختلافِ رائے کا طریق کار اور Process کیا ہو گا۔ بحمدِ اللہ تنظیم اسلامی کے دستور العمل میں' جس کی تدوین میں اوقات اور صلاحیتوں کا اچھا خاصا اثاثہ صرف ہوا' ان تمام گوشوں کا عمدہ طریقے پر احاطہ کیا گیا ہے اور وہ امور جو جمعیت شبان المسلمین ہند کے دستور میں تشنہ نظر آتے ہیں ان کی تلافی کا مکمل سامان بھی فراہم ہو گیا ہے۔ ہمیں یقین ہے کہ علامہ اقبال کی تجویز کردہ یہ جماعت اگر اپنے سفر کا باقاعدہ آغاز کر دیتی اور کچھ عرصہ منزل کی جانب اپنا سفر جاری رکھتی تو وہاں بھی بتدریج ان تشنہ گوشوں کی تلافی کا سامان ہو جاتا۔

☆ ☆ ☆

علامہ اقبال کی رہنمائی میں "جمعیت شبان المسلمین ہند" کے قیام کی تجویز کو تحریری شکل دینے اور اس کی تشکیل کے لئے بھاگ دوڑ کرنے والے حضرت علامہ کے نوجوان ساتھی خواجہ عبدالوحید نے تحریک شبان المسلمین کے تعارف پر مشتمل اپنے ایک مضمون میں جو اقبال اکیڈمی پاکستان کے مجلّہ "اقبال ریویو" کی جولائی ۶۷ء کی اشاعت میں شائع ہوا' بصراحت لکھا ہے کہ "جماعت مجاہدین علی گڑھ" اور "جمعیت شبان المسلمین ہند" دونوں جماعتوں کے قیام کا اصل مقصد "اعلاء کلمتہ اللہ" تھا {۴}' اور یہ کہ دونوں جماعتوں کے

{۴} اس امر کی بھرپور تائید دونوں جماعتوں کی اساسی دستاویزات اور دستور العمل سے متعلق تفصیلات سے بھی ہوتی ہے جن کا قدرے تفصیلی ذکر سطور بالا میں کیا جا چکا ہے۔ تاہم حیرت ہوتی ہے کہ اس کھلی حقیقت کے ہوتے ہوئے بھی بعض لوگ مصر ہیں کہ ان جماعتوں کے قیام کا مقصد محض مسلمانان ہند کی سیاسی آزادی کا حصول تھا جو بالآخر مسلم لیگ کے ذریعے پورا ہو گیا'------- اسی طرح بعض حضرات کا خیال ہے کہ ان دونوں جماعتوں کے قیام سے علامہ اقبال کا مقصود محض ایک "کلچرل انسٹی ٹیوٹ" قائم کرنا تھا'---- ناطقہ ←

سرکردہ افراد کے ذہنوں میں مشترک امیر کے طور پر اسی شخص کا نام تھا جس کے انقلاب آفرین افکار نے ان کے دلوں میں احیاء اسلام کی جوت جگائی تھی' یعنی علامہ ڈاکٹر محمد اقبال۔ خواجہ عبدالوحید لکھتے ہیں :

"بیسویں صدی کے رُبعِ اول میں اسلامیان ہند نے بڑی بڑی عظیم الشان تحریکیں چلائیں جن کا تعلق براہ راست برطانوی استعمار کے خلاف جدوجہد کرنے سے تھا۔ تحریک خلافت کے بعد مسلمانانِ ہند پر یاس و قنوطیت کا عالم چھا گیا۔ اس کے بعد مختلف مقامات کے حساس مسلمانوں میں اعلاء کلمتہ اللہ کے لئے جذبۂ عمل بیدار ہوا۔ ۱۹۳۵ء کے لگ بھگ مختلف طرح کے لوگوں میں احیائے اسلام کے لئے سوچ بچار شروع ہو گئی تھی۔ علی گڑھ میں ڈاکٹر سید ظفرالحسن صاحب صدر شعبہ فلسفہ مسلم یونیورسٹی اور مشرقی پنجاب میں میر غلام بھیک نیرنگ جیسے لوگ اس موضوع پر سوچ بچار کر رہے تھے۔ اسی زمانے میں لاہور کے چند نوجوان بھی اس طرف متوجہ ہوئے۔ ان سب لوگوں کے اس سوچ بچار کے لئے مرکزی شخصیت ایک ہی تھی' یعنی علامہ سر محمد اقبال" چنانچہ ان میں سے ہر ایک علیحدہ علیحدہ ان سے زبانی یا تحریری طور پر تبادلہ خیالات کر رہا تھا۔"

☆ ☆ ☆

خواجہ عبدالوحید نے اپنے مذکورہ مضمون میں اپنی ذاتی ڈائری سے ۲۸ فروری ۳۵ء سے لے کر ۲/ ستمبر ۱۹۳۵ء تک کے عرصے میں پیش آنے والے وہ چیدہ چیدہ واقعات نقل کئے ہیں جو جمعیت شبان المسلمین ہند کی تاسیس و تشکیل اور اس ضمن میں درجہ بدرجہ ہونے والی پیش رفت سے متعلق ہیں۔ ڈاکٹر برہان احمد فاروقی صاحب نے اپنی کتاب میں خواجہ صاحب کے مضمون میں شامل تمام تفصیلات درج کرنے کے علاوہ علامہ اقبال سے اپنی ان ملاقاتوں کا ذکر بھی کیا ہے جو انہوں نے اسی عرصے کے دوران ڈاکٹر سید ظفرالحسن

← سربگریباں ہے اسے کیا کہئے! یہ طرز فکر صرف ان لوگوں کا ہو سکتا ہے جنہوں نے یا تو ڈاکٹر برہان احمد فاروقی کی کتاب کے محض سرسری اور جزوی مطالعے پر اکتفا کی ہے یا پھر جماعت 'امارت' بیعت اور اطاعتِ امیر کے تصورات سے انہیں اس درجہ ذہنی بُعد ہے کہ ان سے بہرصورت اغماض برتنا ان کی ایک نفسیاتی ضرورت بن چکا ہے۔ واللہ اعلم!

صاحب کے خصوصی نمائندے کے طور پر حضرت علامہ سے کیں۔ زیر نظر مضمون میں ان تمام واقعات و تفصیلات کا من و عن بیان پیش نظر نہیں ہے' تاہم چیدہ چیدہ واقعات اور بعض اہم معاملات کا تذکرہ ضروری ہے۔

۲۸ فروری ۳۵ء کے حوالے سے اپنی ڈائری کے جو چند جملے خواجہ صاحب نے اپنے مضمون میں درج کئے ہیں ان سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ جمعیت شبان المسلمین ہند کا سارا نقشہ حضرت علامہ نے خود تجویز کیا تھا اور اسے انہی خطوط پر مرتب کیا تھا جن خطوط پر ڈاکٹر سید ظفر الحسن صاحب نے جماعت مجاہدین علی گڑھ کو استوار کیا تھا۔ خواجہ صاحب لکھتے ہیں :

"کل رات صوفی صاحب کے ہاں (مراد ہیں صوفی غلام مصطفیٰ تبسم) اس غرض سے مجلس مشاورت منعقد ہوئی کہ سر محمد اقبالؒ کے تجویز کردہ نظام شبان المسلمین پر غور کیا جائے۔ دراصل یہ سکیم جو ہمارے زیر غور ہے غلام بھیک نیرنگ اور ڈاکٹر سید ظفر الحسن کی تجویز کی ہوئی ہے' جس کا مقصد ہندوستان میں مسلمانوں کا عروج و اقبال ہے۔ افسوس ہے کہ ان دونوں کی طرف سے آئے ہوئے کاغذات ڈاکٹر صاحب کے پاس ہیں اور وہ بھوپال گئے ہوئے ہیں۔ اس لئے اس مسئلے پر صحیح طور پر غور نہیں ہو سکتا۔"

۵/ اپریل ۳۵ء کی ڈائری کے حوالے سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ علامہ کی تجویز کردہ سکیم کو تحریری صورت میں مرتب کرنے کا کام خواجہ عبدالوحید صاحب نے سرانجام دیا تھا۔ اور حضرت علامہ کی ہدایت پر انہوں نے اس ضمن میں ڈاکٹر سید ظفر الحسن اور میر غلام بھیک نیرنگ سے سلسلہ جنبانی کا آغاز بھی کیا۔ ڈائری ملاحظہ ہو :

"۵/ اپریل ۱۹۳۵ء۔ کل حسب الارشاد سر محمد اقبال ایک مضمون مجوزہ جمعیت شبان المسلمین تیار کیا اور دفتر جاتے ہوئے حضرت علامہ کو دکھایا۔ انہوں نے پسند فرمایا۔ دفتر میں مسٹر افضل بھٹی سے اس مضمون کی چار نقلیں کرا لیں۔ اب ان پر لوگوں کے دستخط کرائے جائیں گے۔ پھر دستخط کرنے والوں کا اجلاس ہو گا جس میں جمعیت کا رسمی طور پر قیام اور امیر کا انتخاب ہو گا اور اس کے بعد قیام و انتخاب کا اعلان کیا جائے گا۔

> جس زمانہ میں میرے احباب کی توجہ اس طرف ہوئی تھی ہم میں سے کوئی بھی اس حقیقت سے واقف نہ تھا۔ جب پہلی مرتبہ علامہ مرحوم سے اس بارے میں گفتگو ہوئی تو انہوں نے فرمایا کہ میر غلام بھیک نیرنگ اور ڈاکٹر سید ظفر الحسن صاحب بھی ان خطوط پر سوچ رہے ہیں اور انہوں نے اپنے خیالات تحریر میں پیش بھی کئے ہیں۔ آپ لوگ ان سے خط و کتابت کر کے دونوں کی تجاویز حاصل کریں۔ چنانچہ میں نے ان دونوں بزرگوں سے خط و کتابت شروع کر دی.....“

☆ ☆ ☆

اپریل کے اواخر میں ڈاکٹر سید ظفر الحسن صاحب نے علی گڑھ سے اپنے دو ہونہار شاگردوں کو بطور نمائندہ لاہور بھیجا تاکہ وہ علامہ اقبال اور خواجہ عبدالوحید صاحب سے مل کر جمعیت شبان المسلمین کی مجوزہ سکیم کے بارے میں تفصیلی طور پر تبادلہ خیال کریں۔ علی گڑھ سے آنے والے ان دو صاحبان میں ایک ڈاکٹر برہان احمد فاروقی صاحب تھے جن کے ذریعے جماعت مجاہدین علی گڑھ سے متعلق جملہ معلومات ہم تک پہنچی ہیں اور دوسرے ڈاکٹر ایم احمد صاحب تھے۔ ڈاکٹر سید ظفر الحسن نے اپنے ان دونوں شاگردوں کو یہ ہدایت بھی کی تھی کہ وہ حضرت علامہ کو اس بات پر آمادہ کریں کہ وہ دونوں جماعتوں کے مشترک امیر کے طور پر جماعت کی امارت کی ذمہ داری قبول کریں تاکہ سب متحد ہو کر ایک امیر کی قیادت میں اس مبارک جدوجہد کا آغاز کر سکیں۔ ان دونوں حضرات کی حضرت علامہ اور خواجہ عبدالوحید صاحب کے ساتھ باقاعدہ میٹنگ ۲۸/ اپریل ۳۵ء کو علامہ کے مکان (جاوید منزل، واقع میو روڈ، لاہور) پر ہوئی۔ ڈاکٹر برہان احمد فاروقی نے علامہ کے ساتھ اپنی اس اہم ملاقات کا ذکر بایں الفاظ کیا ہے :

> ”۲۸/ اپریل ۳۵ء کو راقم الحروف (برہان احمد فاروقی) اور ایم ایم احمد صاحب علامہ اقبال کی خدمت میں ان کے مکان جاوید منزل (واقع میو روڈ لاہور) میں حاضر ہوئے۔ مغرب کا وقت ”جمعیت شبان المسلمین“ کے بارے میں گفتگو کرنے کے لئے مقرر ہوا تھا تاکہ خواجہ عبدالوحید صاحب کو بھی مع ان کے دوستوں کے بلایا جا سکے۔

جب ہم سب حضرت علامہ کے مکان پر جمع ہوئے تو ایک ایسی تنظیم کی احتیاج اور اس کے قیام کی شرائط پر حضرت علامہ نے گفتگو شروع کی.... حضرت علامہ نے فرمایا کہ میری رائے یہ ہے کہ مسلمانوں کی کوئی تحریک اس وقت تک کامیاب نہیں ہو سکتی جب تک اس کے روحانی پہلو کی تربیت بھی نہ ہو۔ میں نے عرض کیا کہ آپ اس کے لئے تیار ہوں تب ہی یہ پہلو ابتداً سامنے رکھا جا سکتا ہے کیونکہ مجھے یہ کہہ کر یہاں بھیجا گیا ہے کہ اگر آپ اس کے لئے تیار ہوں تو ابھی علی گڑھ جا کر ڈاکٹر سید ظفر الحسن صاحب کو یہاں لا کر آپ کے دست مبارک پر بیعت کر کے آپ کی امارت میں جماعت کے قیام کا اعلان اخبارات میں کر کے کام شروع کر دیتے ہیں' مگر حضرت علامہ خاموش ہو گئے اور اگلے روز یعنی ۲۹/اپریل کو خواجہ عبدالوحید صاحب کے مکان پر میٹنگ ہوئی۔ اس میٹنگ میں جمعیت شبان المسلمین کے دستور کے بارے میں جملہ امور طے کئے گئے۔"

☆ ☆ ☆

اس کے بعد اس معاملے میں کیا پیش رفت ہوئی' ڈاکٹر برہان احمد فاروقی مرحوم نے اپنی اس کتاب میں اپنی جانب سے مزید کوئی تفصیل بیان نہیں کی' نہ ہی حضرت علامہ کے ساتھ اپنی ۲۸/اپریل ۳۵ء کی ملاقات پر کسی قسم کا کوئی تبصرہ کیا' تاہم انہوں نے تحریک شبان المسلمین کے بارے میں خواجہ عبدالوحید صاحب کے مضمون کے آخری حصہ کو جو ۲۱/اگست سے ۲۲/ستمبر ۳۵ء تک اور پھر ۱۴/مارچ ۱۹۳۶ء کی ڈائری سے ماخوذ یادداشتوں پر مشتمل ہے' من و عن نقل کر دیا ہے۔ خواجہ صاحب کی ڈائری کے ان اوراق کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ ۲۱/اگست ۱۹۳۵ء کو جمعیت شبان المسلمین کی بنیاد باضابطہ طور پر رکھ دی گئی تھی۔ اس موقع پر تمام ارکان نے اطاعتِ امیر کا عہد کیا اور امارت کے لئے متفقہ طور پر علامہ اقبال کا نام تجویز کیا گیا۔ خواجہ صاحب نے اپنی ڈائری میں ان حضرات کے نام بھی درج کئے ہیں جو شریک اجلاس تھے۔ ڈائری کا متعلقہ حصہ ملاحظہ ہو!

"۲۱/اگست ۱۹۳۵ء: ہمارے ہاں مجوزہ جمعیت شبان المسلمین کے ہمدردوں کا جلسہ ہوا جس میں جمعیت کی بنیاد رکھ دی گئی' نیز ارکان نے تحریری طور پر اطاعت امیر کا عہد کیا اور جمعیت کی امارت کے لئے علامہ سر محمد اقبالؒ کا اسم گرامی تجویز ہوا۔ نیز

جنزل سیکرٹری کا کام ثاقب صاحب کے سپرد ہوا اور خزانچی بدر صاحب مقرر ہوئے۔

آج ہمارے ہاں کا اجلاس بہت کامیاب رہا' غیر معمولی رونق تھی' نذیر نیازی صاحب نے گفتگو کو بہت پر لطف بنا دیا۔ ان کے علاوہ ڈاکٹر عبد المجید صاحب' ثاقب صاحب' افضل صاحب' بدر صاحب' طارق صاحب' ابو الخیر صاحب' پنی صاحب' خواجہ غلام دستگیر صاحب' ارمان صاحب بھی تھے۔"

۲۲/ اگست کی ڈائری میں کوئی واقعہ تو مذکور نہیں ہے' تاہم یہاں خواجہ صاحب نے حضرت علامہ کے بارے میں اپنا ایک تاثر درج کیا ہے جس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ احیاءِ اسلام کی آرزو اور اس کے لئے فدائین کی ایک جماعت کی تشکیل کی خواہش حضرت علامہ ہی کے نہیں' خود ان کے اپنے دل میں بھی کس شدت کے ساتھ موجزن تھی۔ لکھتے ہیں :

"۲۲/ اگست ۱۹۳۵ء: علامہ سر محمد اقبالؒ کے دل میں اسلام کا جو درد موجود ہے اور اسلام کو دنیا میں اقبال اور سربلند دیکھنے کا جو جذبہ ان کے قلب میں موجزن ہے اس کے بروئے کار آنے کی شدید ضرورت ہے اور اس کی صورت یہی ہے کہ ان کے گرد فدائیوں کا ایک ایسا گروہ جمع کر دیا جائے جو صدق دل کے ساتھ اپنے آپ کو ان کے سپرد کر دینے پر آمادہ ہو۔ اس صورت میں ایک طرف خود حضرت علامہ اقبال کے دل و دماغ میں ایک ایسی حرکت پیدا ہو گی جو قوم سے کام لے سکے گی اور دوسری طرف وہ جماعت آپ سے وابستہ ہو چکی ہو گی جس میں زبردست قوتِ عمل بروئے کار آئے گی۔ خدا کرے کہ میرا یہ خواب سچا ثابت ہو اور نوجوانانِ اسلام کثیر تعداد میں ایک فعال جماعت کی صورت میں منظم ہو جائیں۔"

یکم ستمبر کو جمعیت شبان المسلمین کے اجلاس میں رکنیت فارم مطبوعہ شکل میں حاضرین میں تقسیم کئے گئے۔ اس اجلاس میں یہ بھی طے کیا گیا کہ جمعیت کی طرف سے ایک وفد حضرت علامہ سے ملاقات کر کے انہیں اب تک کی پیش رفت سے آگاہ کرے تاکہ اب اس کام کو جلد از جلد' حضرت علامہ کی قیادت اور رہنمائی میں بھرپور انداز میں آگے بڑھایا جا سکے۔ مطبوعہ فارم میں بھی امیر جماعت کے طور پر بصراحت حضرت علامہ ہی کا نام تجویز کے

انداز میں مذکور تھا۔ خواجہ صاحب کے اپنے الفاظ ملاحظہ ہوں :

"یکم ستمبر ۱۹۳۵ء : آج جمعیت شبان المسلمین کا اجلاس میرے مکان پر ہوا اور رکنیت کے مطبوعہ فارم حاضرین میں تقسیم ہوئے۔ قرار پایا کہ کل ایک وفد حضرت علامہ کی خدمت میں پیش ہو کر اس جماعت کی طرف سے چند معروضات پیش کرے اور کوشش کی جائے کہ جلد از جلد کام شروع ہو جائے۔

۲/ ستمبر ۱۹۳۵ء : آج دفتر الاسلام کو جاتے ہوئے میں علامہ سر محمد اقبال سے ملا اور انہیں مطبوعہ فارم (رکنیت) دکھایا۔ آپ نے فرمایا کہ یہ فارم ڈاکٹر سید ظفر الحسن صاحب کو علی گڑھ بھیجا جائے۔

اس فارم کا مضمون حسب ذیل ہے :

۱ - ہندوستان میں مسلمانوں کے عروج و اقبال کے حصول کے لئے جو جماعت قائم کی گئی ہے میں اس کا رکن بننے کے لئے تیار ہوں اور اس بات کا عہد کرتا ہوں کہ امیر کی اطاعت قرآن و سنت کے مطابق بہر حال اور ہر وقت بلا چون و چرا کروں گا۔

۲ - میں متمنی ہوں کہ اس جماعت کی امارت علامہ سر محمد اقبال مدّ ظلہ' کے دست مبارک میں ہو۔

نام پتہ و دستخط

اس کے بعد وسط مارچ ۳۶ء تک گویا اگلے قریباً چھ ماہ تک پیش آمدہ واقعات کے بارے میں خواجہ صاحب بھی بالکل خاموش ہیں۔ پھر ۱۴/ مارچ ۱۹۳۶ء کی ڈائری سے درج ذیل اقتباس انہوں نے اپنے مضمون میں شامل کیا ہے جس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ اس چھ ماہ کے عرصے کے دوران نہ صرف یہ کہ اس باب میں مزید کوئی پیش رفت نہ ہو سکی بلکہ آرزوؤں اور امیدوں کی یہ خوشنما بیل بوجوہ پنپنے اور برگ و بار لانے کی بجائے ابتدائی مرحلے ہی میں مرجھا کر رہ گئی۔ خواجہ صاحب لکھتے ہیں :

"۱۴/ مارچ ۱۹۳۶ء : آج میرے مکان پر معتقدینِ اقبال کا اجتماع ہوا جس میں راجہ حسن اختر اور پروفیسر منیر الدین صاحب کے علاوہ جناب ثاقب صاحب' نبی صاحب' ابو الخیر صاحب' ڈاکٹر بھٹی صاحب بھی شریک ہوئے اور ظاہر ہوا کہ لوگ

اصل تجویز درباره جمعیت شبان المسلمین پر عمل پیرا ہونے کے لئے تیار نہیں۔ وہ سب محض اس بات کے حامی تھے کہ ایک دار المطالعہ قائم کیا جائے جہاں اقبال کی کتابوں کا مطالعہ اور ان کی تعلیمات کی نشر و اشاعت ہوا کرے۔ چنانچہ اس پر اجلاس ختم ہو گیا۔

ایک بڑی ہی خوش آئند تحریک کا ایک المناک انجام ہم لوگوں کے کمزور ارادوں کا ثبوت پیش کرتا ہے۔"

☆ ☆ ☆

یوں ایک اصولی اسلامی جماعت کے قیام کی یہ نہایت وقیع اور قابل قدر کوشش تشکیل و تاسیسِ جماعت کے ابتدائی مراحل کامیابی کے ساتھ طے کرنے کے بعد میدانِ عمل میں باقاعدہ قدم رکھنے سے قبل ہی حسرتناک انجام سے دوچار ہو گئی۔ اس میں جہاں علامہ اقبال کے "معتقدین" کی کم ہمتی اور کم کوشی کو یقینی طور پر دخل تھا وہاں زیادہ قرینِ قیاس بات وہ ہے جو آل پاکستان اسلامک ایجوکیشن کانگریس کے ڈائریکٹر چوہدری مظفر حسین صاحب نے ڈاکٹر برہان احمد فاروقی صاحب کی زیر نظر کتاب کے پیش لفظ میں بیان کی ہے' یعنی یہ کہ علامہ کی اس کوشش کے باوصف کہ وہ اس منصوبے کو پردۂ خفا میں رکھنا چاہتے تھے' برطانوی حکومت کی طرف سے حضرت علامہ اور ان کی سرگرمیوں کی نگرانی پر مامور افراد کو چونکہ اس منصوبے کا علم ہو گیا تھا لہٰذا یہ منصوبہ ترک کرنا پڑا۔ چودھری صاحب لکھتے ہیں :

"ڈاکٹر برہان احمد فاروقی کے اس مقالہ میں اس امر پر روشنی نہیں ڈالی گئی کہ یہ منصوبہ یکایک کیوں ترک کر دیا گیا لیکن انہوں نے اس بات کی طرف اشارہ کر دیا ہے کہ اس طرح کے کاموں میں برطانوی استعمار کی طرف سے جو موانع پیدا کئے جا رہے تھے ان کے پیش نظر یہ منصوبہ بہت احتیاط اور رازداری کا تقاضا کرتا تھا' مگر علامہ اقبال کے وہ "فدائین" جو حکومت کی طرف سے "علامہ اقبال کی نگرانی پر مامور تھے" اس منصوبے سے واقف ہو گئے' اس لئے یہ منصوبہ ترک کر دینا پڑا۔ خواجہ عبدالوحید کی تحریر سے بھی اس امر کی تائید ہوتی ہے "معتقدین اقبال" ہی

اس منصوبہ پر عمل پیرا ہونے کو تیار نہیں تھے۔"

بعض لوگوں نے ڈاکٹر برہان احمد فاروقی مرحوم کی اس روایت سے کہ ڈاکٹر سید ظفر الحسن کی اس تجویز کے جواب میں کہ حضرت علامہ اس پوری تحریک کی قیادت سنبھالیں اور منصبِ امارت قبول فرمائیں حضرت علامہ نے خاموشی اختیار کی' یہ مفہوم اخذ کیا ہے کہ علامہ نے اس تجویز کو قبول کرنے پر آمادگی ظاہر نہیں کی۔ لیکن مشہور عوامی مقولے "الخاموشی نیم رضا" کے مصداق تو حضرت علامہ کی خاموشی یقینی طور پر قبولیت کے مترادف قرار پاتی ہے۔ اس کی توثیق جناب بی اے ڈار کی اس روایت سے بھی ہوتی ہے جو انہوں نے اپنی کتاب "The Letters and writings of Iqbal" کے صفحہ ۶ پر درج کی ہے کہ "علامہ نے امارت کے منصب کو جھجکتے ہوئے قبول کر لیا تھا"

رہے حضرت علامہ کے وہ الفاظ جو انہوں نے اپنے ۱۲/ جولائی ۳۲ء والے خط میں جماعت مجاہدین علی گڑھ کے منصوبے کی بھرپور تائید و توثیق کرنے اور اس کی تائید میں اپنی روحانی واردات کا ذکر کرنے کے بعد اپنے بارے میں اعترافاً تحریر فرمائے تھے' یعنی :

> "یہاں کے طبائع کی رو سے ایک ہی طریقہ مؤثر ہو سکتا ہے' لیکن میں اس کے لئے اپنے آپ کو موزوں نہیں پاتا' یا یوں کہئے اپنے میں اس قسم کی جرأت نہیں دیکھتا۔"

تو اولاً یہ الفاظ ان کی عالی ظرفی اور منکسر المزاجی کا مظہر ہیں' ثانیاً یہ تحریر ۳۲ء کی ہے' اور خود حضرت علامہ کا ۳۵ء کا طرز عمل لامحالہ اس کا "ناسخ" قرار پاتا ہے۔

بہرکیف' اس منصوبے کی ناکامی کا سبب خواہ کوئی بھی ہو' یہ ایک ناقابل تردید حقیقت ہے' اور ہماری اصل دلچسپی بھی اسی معاملے سے ہے' کہ علامہ اقبال اپنی عمر کے آخری حصے میں' ۱۹۳۲ء سے ۱۹۳۵ء کے درمیان' بیعت اور امارت کی بنیاد پر فداکاروں پر مشتمل ایک ایسی جماعت کی تشکیل کی بھرپور کوشش کرتے رہے جس کے قیام کا اصل مقصد "اعلاءِ کلمۃ اللہ" یعنی دین حق کے غلبے اور اقامت کے لئے انقلابی انداز میں جدوجہد کرنا تھا۔ اس جماعت کے نقشہ کار اور دستور العمل میں جو خود حضرت علامہ کی رہنمائی میں اور ان ہی کے

مشوروں سے مرتب ہوا' ایک اصولی اسلامی جماعت کا مکمل خاکہ موجود تھا' جس میں "اطاعتِ امیر" کے اصول کو مرکز و محور کی حیثیت حاصل ہوتی ہے۔ ہمیں خوشی ہے کہ بالکل انہی اصولوں پر اور انہی اہداف کے لئے تنظیم اسلامی کا قیام عمل میں آیا ہے جسے بحمد اللہ اپنے سفر کا آغاز کئے اب بیس برس سے زائد ہو چکے ہیں۔ ہم یہ کہنے میں حق بجانب ہیں کہ حضرت علامہ کے اس خواب کی بتمام و کمال تعبیر صرف اور صرف محترم ڈاکٹر اسرار احمد کی پیہم کاوشوں کے نتیجے میں تنظیم اسلامی کی صورت میں سامنے آئی ہے' جس کی حسرت دل میں لئے حضرت علامہ اس دنیا سے تشریف لے گئے تھے اور ان کی وفات کے ساتھ ہی ان کی حیات کا یہ نہایت اہم باب بھی پردۂ خفا میں چلا گیا تھا۔

حیات اقبال کا یہ گمشدہ ورق اب ڈاکٹر برہان احمد فاروقی مرحوم و مغفور کی زیر نظر کتاب کے ذریعے منظر عام پر آیا ہے جس کی اشاعت پر ہم آل پاکستان اسلامک ایجوکیشن کانگریس کے اربابِ کار بھی ممنونِ احسان ہیں جن کے ذریعے تاریخ کی اس گرانقدر امانت کی حفاظت کا سامان ہوا۔ فجزاھم اللّٰہ احسن الجزاء ○○

ماہنامہ "میثاق" کے ۶۸۔۱۹۶۷ء کے اداریوں پر مشتمل

ڈاکٹر اسرار احمد کی ایک اہم تالیف :

اسلام اور پاکستان

جسے بجا طور پر تحریک پاکستان کے تاریخی و سیاسی پس منظر ---اور

اسلامیان پاکستان کے تہذیبی و ثقافتی پس منظر پر

ایک جامع و مربوط دستاویز کی حیثیت حاصل ہے۔

قیمت : اعلیٰ ایڈیشن (مجلد)۔/۴۰ روپے اشاعت عام : ۔/۱۶ روپے

مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

۳۶۔کے' ماڈل ٹاؤن لاہور (۵۴۷۰۰)

تازہ خواہی داشتن گر داغ ہائے سینہ را
گاہے گاہے باز خواں ایں قصّہ پارینہ را!

پاکستانی سیاست کا
پہلا عوامی وہنگامی دور

(۳)

سیاسی افراتفری کا اندوہناک نتیجہ
مشرقی پاکستان کی علیحدگی

امیر تنظیم اسلامی اور داعی تحریکِ خلافت پاکستان

ڈاکٹر اِسرار احمد

کے سیاسی تجزیے

جو ۷۱-۱۹۷۰ء کے دوران ماہنامہ "میثاق" کے ادارتی صفحات میں شائع ہوئے

"دیکھ کعبے میں شکستِ رشتہ تسبیحِ شیخ!"

اگست ۱۹۷۰ء

پاکستان کی موجودہ حکومت کا یہ کارنامہ بلاشبہ نہایت قابلِ داد ہے کہ اس نے ڈیڑھ سال سے بھی کم مدت میں ملک کو سخت ہیجان انگیز اور ہنگامہ خیز "انقلابی" فضا سے نکال کر نہایت پُر سکون "سیاسی" جدّوجہد کی راہ پر ڈال دیا ہے ----- واقعہ یہ ہے کہ اِس وقت پاکستان کے طول وعرض میں "انتخابی" سرگرمی جس زور شور کے ساتھ لیکن جس ہموار طریقے پر جاری ہے اس کے پیش نظر یہ باور کرنا مشکل معلوم ہوتا ہے کہ صرف سال سوا سال قبل یہاں "گھیراؤ" اور "جلاؤ" کی باتیں ہو رہی تھیں۔ اور مظاہروں، جلوسوں اور ہڑتالوں سے شہری زندگی تقریباً معطل ہو گئی تھی ----- اور نہ صرف باہمی تصادم اور سر پھٹوّل بلکہ باقاعدہ کشت وخون اور سِوِل وار کا خطرہ درپیش تھا!

صدر یحییٰ نے اپنی ۲۸/ جولائی کی نشری تقریر میں اگر اس سلسلے میں کسی کریڈٹ کا دعویٰ کیا ہے تو یہ یقیناً ان کا حق ہے ----- جس قسم کے ناگفتہ بہ اور مخدوش حالات میں انہوں نے حکومت کی ذمہ داری سنبھالی تھی ان کا بیان تحصیلِ حاصل ہے، الجھی ہوئی صورت حال کی یہ گتھّی کسی نہایت پختہ کار، معاملہ فہم اور سلجھے ہوئے سیاست دان کے ناخنِ تدبیر ہی سے سلجھ سکتی تھی۔ اس لئے کہ اس قسم کے حالات میں ذرا سی بے احتیاطی نہایت مضر نتائج پیدا کر سکتی ہے اور جہاں ضرورت سے زیادہ نرمی سے لوگوں کی جرأتیں بڑھ جانے کا اندیشہ ہوتا ہے وہاں ضرورت سے زیادہ سختی بھی جلتی پر تیل کا کام کر سکتی ہے ----- گویا "سردی گرمی، نرمی سختی" کا ایک نہایت معتدل سا امتزاج ہی ایسے مواقع پر کامیاب ہو سکتا ہے۔ چنانچہ ماننا پڑتا ہے کہ صدر یحییٰ اس "بال سے زیادہ باریک اور تلوار کی دھار سے زیادہ تیز" راستے پر چلنے میں کامیاب رہے ----- ابتدا میں انہوں نے قدرے نرمی سے

کام لیا جسے، جیسا کہ خود انہوں نے فرمایا، کچھ لوگوں نے کمزوری پر محمول کیا، لیکن انجام کاران کی یہ پالیسی صحیح ثابت ہوئی اور اس طرح واقعتاً لوگوں کے دلوں کی بھڑاس نکل گئی۔ چنانچہ بعد میں انہوں نے تدریج کے ساتھ باگیں کھینچنی شروع کر دیں تا آنکہ آج اُدھر مولانا بھاشانی کے صاحبزادے "اندر" ہیں اور مسیح الرحمان صاحب بھی معافی مانگ کر ہی "باہر" آسکے ہیں، اور اِدھر مسٹر بھٹو کی شوخیاں قصۂ ماضی بن چکی ہیں اور اب وہ ہر بات ناپ تول کر کر رہے ہیں ----- اور صورت یہ ہے کہ انتخابی جلسے اطمینان اور سکون کے ساتھ ہو رہے ہیں اور کہیں گڑبڑ نہیں ہو پاتی اور بڑے بڑے جلوس نکل رہے ہیں لیکن ہنگامہ نہیں ہوتا اور بڑے بڑے جغادری قسم کے "انقلابی" رہنما بھی ووٹوں اور سیٹوں کے "اہتمامِ خشک و تر" کے شدید "دردِ سر" میں مبتلا کاسۂ گدائی لئے مارے مارے پھر رہے ہیں۔

اِن حالات میں صدر یحییٰ کا تازہ انتباہ بروقت بھی ہے اور نہایت معنی خیز بھی۔ اس لئے کہ اب حالات جس مرحلے میں داخل ہو چکے ہیں اس میں تھوڑی سی نرمی سے بھی سارے کئے کرائے پر پانی پھر سکتا ہے اور اب نہ صرف یہ کہ اگر حکومت امن و سکون کے قیام اور نظم و ضبط کو برقرار رکھنے کے لئے سختی کرے تو وہ بالکل حق بجانب ہوگی بلکہ اگر صورت اس کے برعکس ہو اور حکومت کی نرمی کی وجہ سے صورت حال دوبارہ بگڑ جائے تو خود حکومت پر یہ الزام آئے گا کہ وہ اقتدار کی منتقلی کو معرضِ التوا میں رکھنا چاہتی ہے۔

اور یہ وہ الزام ہے جس سے موجودہ حکومت کم از کم تاحال بالکل بری ہے ----- اس لئے کہ اگرچہ نیتوں اور ارادوں کا جاننے والا تو اللہ ہی ہے تاہم اِس وقت تک صدر یحییٰ اور ان کی حکومت کے بارے میں کسی انتہائی بدگمان مزاج انسان کے لئے بھی یہ کہنا کسی طرح ممکن نہیں کہ وہ اقتدار کو عوام کے منتخب نمائندوں کی طرف منتقل کرنے کے معاملے میں نیک نیت نہیں ہیں۔ انہوں نے اس معاملے میں جس پختہ عزم کے ساتھ مسلسل اور بروقت اقدامات کئے ہیں اس سے تاحال ان کی پوزیشن شک و شبہ سے بالکل بالا رہی ہے۔ اور اب اسی پوزیشن کا تقاضا ہے کہ ایک طرف تو وہ انتخابات کے لئے سازگار فضا برقرار رکھنے کی ہر ممکن کوشش کریں اور اس معاملے میں کسی نرمی کو ہرگز راہ نہ دیں بلکہ اگر ضرورت ہو تو انتخابات کے بالکل قریب ملک پر نیم فوجی و نیم سول حکومت کی بجائے خالص فوجی نظم قائم کر دیں (اس سلسلے میں ہمارے نزدیک یہ مطالبہ بھی بالکل صحیح ہے کہ

انتخابات سے دو ماہ قبل کم از کم صدارتی کابینہ کو تو سبکدوش کر ہی دیا جائے)----اور دوسری طرف انتخابات کے التوا کے کسی مطالبے پر کان نہ دھریں بلکہ ووٹروں کو ہر امکانی سہولت مہیا کرنے پر خواہ کتنا ہی خرچ آ جائے انتخابات مقررہ تاریخ پر ضرور منعقد کرائیں' تاکہ اس شبہ کی گنجائش پیدا نہ ہو سکے کہ موجودہ حکومت خود زیادہ دیر تک بر سر اقتدار رہنا چاہتی ہے!

اِس مؤخر الذکر معاملے کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ ہم ایک غریب قوم ہیں اور انتخابی بخار کی جس کیفیت میں ہم اس وقت مِن حیث القوم مبتلا ہیں اس کو طول دینے کی "عیّاشی" کے ہم کسی طرح متحمل نہیں ہو سکتے۔ اس وقت نہ صرف یہ کہ پوری قوم کی توجہ انتخابات پر مرتکز ہو گئی ہے بلکہ ایک غریب قوم کے روپے پیسے کی حقیر پونجی اور صلاحیتوں' قوتوں اور اوقات کے سرمائے کا بڑا حصہ اس مد میں صرف ہو رہا ہے۔ چنانچہ اب یہ مرحلہ جس قدر جلد طے ہو جائے اتنا ہی اچھا ہے اور اس کو طول دینا کسی طرح صحیح نہیں۔ اس لئے کہ :

ع اور بھی دکھ ہیں زمانے میں محبت کے سوا!"

یہ بات محتاجِ بیان نہیں کہ "اقتدار کی منتقلی" کی ذمہ داری کا بوجھ جتنا جتنا موجودہ حکومت کے کندھوں سے اترتا جا رہا ہے اتنا ہی سیاسی جماعتوں اور ان کے رہنماؤں کے کندھوں پر پڑتا چلا جا رہا ہے----اور جس قدر وہ بریُ الذمہ ہوتی جا رہی ہے اسی قدر یہ "ذمّہ دار" بنتے چلے جا رہے ہیں ----تا آنکہ اگر انتخابات بروقت منعقد ہو گئے اور بظاہر احوال اب یہ یقینی ہی سا نظر آتا ہے اور پھر بھی اس ملک کے پیچیدہ مسائل حل نہ ہوئے اور معاملات کی گتھّی نہ سلجھی تو مستقبل کا مؤرخ مجبور ہو گا کہ اس کی ذمہ داری سے موجودہ فوجی حکومت کو بالکل بری قرار دے اور سارا الزام سیاسی جماعتوں اور ان کے رہنماؤں پر عائد کرے----گویا آئندہ چند ماہ ہمارے سیاسی رہنماؤں کے فہم و فراست' تدبّر و حکمت' قربانی و ایثار اور سب سے بڑھ کر حبِّ وطن اور حبِّ قوم کے لئے کھلا چیلنج بن کر آ رہے ہیں اور بزبانِ حال مبارزت خواہ ہیں کہ :

ع "پیش کر غافل عمل کوئی اگر دفتر میں ہے!"

پاکستانی سیاست کا جو دور اواخر ۱۹۶۸ء سے شروع ہوا تھا اس میں اول اول انقلابیت کا دَور دورہ رہا اور اس کی ایسی طوفانی آندھی آئی کہ باقی ہر چیز نگاہ سے اوجھل ہو گئی۔ اس کا زور کم ہوا اور فضا قدرے صاف ہوئی تو اسلام اور سوشلزم کی کاغذی اور ہوائی جنگ شروع ہو گئی اور کچھ عرصے کے لئے تو ایسا سماں بندھا کہ گویا ایک طرف "نظریۂ پاکستان" ہے جو خالص اور بے میل اسلام ہے اور دوسری طرف سوشلزم ہے جو بے شک و بلا ریب کفر ہے ----- اور جنگ بس صرف ان دو کے مابین ہے 'بیچ کی راہ سرے سے کوئی ہے ہی نہیں! ----- ادھر کچھ عرصے سے یہ مصنوعی شوراشوری بھی ختم ہو چکی ہے۔ چنانچہ ہوائی باتوں کے بجائے ٹھوس معاملات پر گفتگو ہونے لگی ہے اور "رومانویت" پر حقیقت پسندی غالب آنے لگی ہے۔ نتیجتاً ایک طرف دولتانہ اور فضل القادر گلے مل گئے ہیں اور بھٹو اور قاضی فضل اللہ میں بھی "معاملے" کی بات چیت ہوئی ہے' چاہے بیل منڈھے نہ چڑھ سکی ہو ------ اور دوسری طرف "انتہاپسندی" کی مذمت ہونے لگی ہے اور باقاعدہ پرچار شروع ہو گیا ہے کہ ملک و ملت کی نجات "بیچ کی راہ" اختیار کرنے میں ہے۔

اس سلسلے میں بعض نہایت "عریاں حقائق" بھی بہت دلچسپ انداز میں پیش کئے جانے لگے ہیں' مثلاً یہ کہ :

"پاکستان 'غیر صالح' لوگوں ہی نے قائم کیا تھا اور وہی اسے قائم رکھ سکتے ہیں...."

یا یہ کہ :

"تحریک پاکستان صرف 'لبرل اسلام' کی علمبردار تھی' نہ کہ رجعت پسند مولویانہ اسلام کی...... !" وغیرہ وغیرہ

ان باتوں پر اس اعتبار سے تو اعتراض کیا جا سکتا ہے کہ یہ "عریاں نگاری" ہے لیکن کون کہہ سکتا ہے کہ یہ "حقیقت نگاری" نہیں۔ سچ ہے ؎

"نکل جاتی ہے جس کے منہ سے سچی بات مستی میں
فقیہِ مصلحت بیں سے وہ رندِ بادہ خوار اچھا!"

ادھر ہمارے 'فقہائے مصلحت بیں' اور 'حکمائے حکمتِ عملی' کا حال یہ ہے کہ نہ صرف یہ

کہ اپنے پورے ماضی سے دستبردار اور سابقہ ہر موقف سے منحرف ہو گئے ہیں بلکہ اپنی ساری ذہانت اس پر صَرف کر رہے ہیں کہ حقائق کو توڑ مروڑ کر اور تاریخ کو مسخ کر کے سچ کو جھوٹ اور جھوٹ کو سچ کر دکھایا جائے۔

چنانچہ "جماعت اسلامی نے کبھی تحریک پاکستان کی مخالفت نہیں کی!" ایسے دروغِ مصلحت آمیز کا سلسلہ تو عرصۂ دراز سے چل ہی رہا تھا' اب ایک قدم آگے بڑھا کر قیام پاکستان کے کریڈٹ میں بھی حصہ داری کا دعویٰ شروع ہو گیا ہے اور اس سلسلے میں جماعت کی سول سروس کے اساتین ایک دوسرے سے بازی لے جانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ یہاں تک کہ ان میں سے ایک نسبتاً سادہ لوح بزرگ تو کچھ عرصہ قبل ایک جلسۂ عام میں یہ تک کہہ بیٹھے کہ :

"پاکستان کے قیام میں اکیلے مولانا مودودی کا حصہ باقی تمام لوگوں کے مجموعی حصے سے بھی زیادہ ہے....!"

---- جس پر پرائے تو خیر پرائے ہی ہوتے ہیں اپنوں (جیسے ہفت روزہ "زندگی" لاہور) کو بھی چیخ اٹھنا پڑا کہ :

"اتنی نہ بڑھا پاکیٔ داماں کی حکایت
دامن کو ذرا دیکھ ذرا بندِ قبا دیکھ!"

ہمارا اسی وقت یہ خیال تھا کہ یہ بات ان کی "طبع زاد" نہیں ہو سکتی۔ چنانچہ حال ہی میں بات واضح ہو گئی اور مولانا مودودی نے بہ نفس نفیس ایک طرف یہ ارشاد فرما کر کہ : "جماعت اسلامی ہندوستان کی مسلمان قوم کے دفاع کے حصارِ ثانوی کے طور پر قائم کی گئی تھی!" ---- قطع نظر اس سے کہ یہ صحیح ہے یا غلط، کم از کم اپنی طرف سے تو اپنی "مسلمان اور موجودہ سیاسی کش مکش حصہ سوم" اور "مسئلہ قومیت" ایسی تالیفات سے اعلانِ براءت کر دیا ---- اور دوسری طرف یہ اعلان کر کے کہ : "ہم نہ مَردوں کو داڑھی رکھنے پر مجبور کریں گے نہ عورتوں کو برقع پہننے پر!" نہ صرف یہ کہ اپنی مایۂ افتخار تصنیف "پردہ" سے رجوع کر لیا بلکہ اپنی مبیّنہ "راسخ العقیدگی" سے تائب ہو کر "لبرل اسلام" کی بارگاہ میں سجدۂ سہو بھی ادا کر دیا۔

"دیکھ کعبے میں شکستِ رشتۂ تسبیحِ شیخ
بتکدے میں برہمن کی پختہ زنّاری بھی دیکھ!"

رہا یہ سوال کہ آیا اس تمام ہیر پھیر سے کچھ حاصل بھی ہو سکے گا یا نہیں؟----تو ظاہر ہے کہ جہاں تک جماعت اسلامی کا تعلق ہے وہ تو بہر حال اتنی بڑی بڑی قیمتیں کسی بڑی توقع ہی پر ادا کر رہی ہے----اور یقیناً کوئی بڑی ہی امید ہے {۱} جس کی بنا پر اپنے پورے دین و مذہب کو "اِک قصّہ ماضی" بنایا جا رہا ہے----لیکن ہمیں یقین ہے کہ قوم کے بارے میں یہ گمان کہ شاید یہ بھی ع "ہنس کے وہ بولی کہ پھر مجھ کو بھی راضی سمجھو!" {۲} والا معاملہ کرلے گی' نری خوش فہمی ہے----یہ دنیا بڑی "حقیقت پسند" واقع ہوئی ہے اور ایسی سطحی باتوں سے یہاں کوئی دھوکا نہیں کھاتا----خصوصاً جو خود اپنے "ماضی" ہی سے رشتہ توڑلیں ان سے کون اپنا "حال" وابستہ کرنا پسند کرتا ہے۔ ان کا انجام تو یہی ہوتا ہے کہ' جیسا کہ کبھی ہم نے پہلے بھی عرض کیا تھا' یہ بے لنگر کی کشتیوں کے مانند لہروں کے رحم و کرم پر ادھر ادھر بھٹکتے رہیں اور ؎

"ہم تو فانی جیتے جی وہ میت ہیں بے گور و کفن
غربت جس کو راس نہ آئی اور وطن بھی چھوٹ گیا!"

کی جیتی جاگتی تصویر----اور خلقِ خدا کے لئے عبرت کا سامان بن جائیں!

{۱} اس فریب خوردگی پر بھی "اسلام پسند" حلقے کے سب سے زیادہ کثیر الاشاعت ہفت روزہ جریدے "زندگی" نے اپنی ایک حالیہ اشاعت میں تحریر کیا ہے کہ : "........لیکن گزشتہ کچھ عرصے سے انتخابی مہم کے دوران جماعت کے مختلف اکابرین نے جس طرح کے مبالغہ آمیز دعوے شروع کئے ہیں ان سے ہر صاحب نظر کو صدمہ پہنچا ہے۔ اس کے رہنماؤں کی طرف سے کبھی تو عوام کو مژدہ سنایا جاتا ہے کہ بلوچستان میں ہماری حکومت قائم ہو جائے گی اور کبھی یہ دعویٰ ہوتا ہے کہ فلاں علاقے پر ہم قبضہ کرلیں گے......ہمیں حیرت ہے کہ ایک ایسی سیاسی جماعت جس کی بنیادی حیثیت دینی ہو' اس کے ذمہ دار ارکان اس قدر غیر ذمہ دارانہ اندازے لگا کر خود کو خوش فہمیوں میں مبتلا کر کے اور عوام کو اپنی کامیابیوں کی لوریاں سنا کر آخر کون سی شے حاصل کر رہے ہیں یا کرنا چاہتے ہیں......"

{۲} ؎ "میرے اسلام کو اک قصّہ ماضی سمجھو!"
ہنس کے وہ بولی کہ "پھر مجھ کو بھی راضی سمجھو!" — اکبر

باب ہشتم

پاکستان کی مذہبی سیاست کا نیا ہدف
”برسراقتدار طبقہ“ کی بجائے ”سوشلزم“

اکتوبر ۱۹۷۰ء

پاکستان کے سیاسی حالات نے اواخر ۱۹۶۸ء سے جو پلٹا کھانا شروع کیا تھا اس کی تیزی اور تندی کو تو اگرچہ سابق صدر ایوب اور حالیہ صدر یحییٰ کی حکمت عملی نے بہت حد تک روک دیا' تاہم وہ تبدیلی اندر ہی اندر دھیمی چال اور مدھم آواز کے ساتھ مسلسل جاری ہے اور اس کے اثرات صرف سیاسی میدان ہی تک محدود نہیں بلکہ ہماری اجتماعی زندگی کا ہر گوشہ اس سے تدریجاً متأثر ہو رہا ہے' حتیٰ کہ صرف دو پونے دو سال میں حالات اس قدر بدل چکے ہیں کہ پہلی بہت سی باتیں بالکل بھولی بسری یادیں معلوم ہوتی ہیں---- اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جیسے ان دو سالوں میں ہم کم از کم بیس سال کی مسافت قطع کر آئے ہیں۔

دوسرے پہلوؤں سے قطع نظر---- صرف ”مذہبی سیاست“ کا جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ اواخر ۱۹۶۸ء سے ماقبل اور مابعد کے حالات میں زمین آسمان کا فرق واقع ہو چکا ہے۔ اور اس کے مقدمات و مبادی اور صغریٰ کبریٰ سمیت ساری منطق تبدیل ہو گئی ہے۔

پاکستان کے پہلے اکیس سالوں کے دوران میں ہماری مذہبی سیاست میں کامل اتحاد اور اتفاق کا سماں بندھا رہا اور مولانا مودودی' مولانا تھانوی یہاں تک کہ مفتی محمود اور مولانا ہزاروی (غور فرمایئے کہ موجودہ حالات کے پیش نظر یہ کس قدر عجیب نظر آتا ہے کہ کبھی کسی مرحلے پر مولانا مودودی اور مولانا ہزاروی بھی ایک ہی کشتی میں سوار رہے ہیں اور دونوں کی حکمت عملی ایک ہی رہی ہے!) ---- ایک ہی راگ الاپتے اور ایک ہی منطق کے چپوؤں سے مذہبی سیاست کی ناؤ کھیتے رہے۔

اس منطق کا صغریٰ کبریٰ یہ تھا کہ ----(i) پاکستان اسلام کے نام پر وجود میں آیا ہے----اور (ii) پاکستان کے عوام کی ایک عظیم اکثریت (نو سو ننانوے فی ہزار کی حد تک!) اسلام ہی کی فدائی اور شیدائی ہے اور اسلامی قانون و دستور ہی کا نفاذ چاہتی ہے----(iii) صرف ایک "بر سرِاقتدار طبقہ" ہے جو قوم کے اس ارادے کی راہ میں مزاحم ہے۔ اور ملک کو دستوری اعتبار سے لادینیت اور تہذیبی و اخلاقی اعتبار سے بے حیائی اور اباحیت پرستی کی راہ پر چلانا چاہتا ہے (iv) لہٰذا ساری اجتماعی جدوجہد کا رخ ان "اربابِ اقتدار" اور اس "بر سرِاقتدار طبقے" کے خلاف ہونا چاہئے۔ اور نہ تو قوم کو ان سے بدظن کرنے کی کوشش میں کوئی کمی رہنے دینی چاہئے اور نہ ہی ان کے خلاف بے چینی اور بے اطمینانی کے کسی موقع سے فائدہ اٹھانے سے چُوکنا چاہئے۔

چنانچہ ان پورے اکیس سالوں کے دوران ہماری تمام مذہبی قوتیں، چاہے وہ جماعتیں تھیں یا جمعیتیں، ایک ہی ہدف پر حملے کرتی رہیں اور تحریر و تقریر کا سارا گولہ بارود ایک ہی نشانے پر صرف ہوتا رہا---- یہ دوسری بات تھی کہ قلعہ تھا خالص ہوائی۔ اس لئے کہ نہ تو کبھی "اربابِ اقتدار" اور "بر سرِاقتدار طبقہ" کی واضح تعریف کی جاسکی اور نہ ہی اس کا حدود اربعہ متعین کیا جا سکا ----

عوام کے بارے میں چونکہ متذکرہ بالا صغریٰ کبریٰ کی رو سے یہ بات طے شدہ تھی کہ وہ تو اسلام کے فدائی اور شیدائی ہیں ہی لہٰذا ان کے ذہن و فکر کی تطہیر اور ان کی سیرت و کردار کی تعمیر کا سوال منطقی طور پر خارج از بحث رہا۔ اور رفتہ رفتہ صورت یہ ہو گئی کہ ان کی طرف سے خطاب کا رخ بالکل پھر گیا۔ گویا ان سے تو کہنے کو کچھ تھا ہی نہیں، کہنا تو جو بھی کچھ تھا وہ ان کے انگوٹھوں، دستخطوں اور قراردادوں کے بل پر "اربابِ اقتدار" سے تھا!

اس سیاست کا عظیم ترین شاہکار ۱۹۵۳ء کی "اینٹی قادیانی موومنٹ" تھی جو شروع تو اگرچہ مجلس احرار اسلام اور جمعیت علمائے ہند کے باقیاتُ الصّالحات نے کی تھی لیکن جس میں بعد میں اضطراراً جماعت اسلامی کو بھی اپنے پورے لاؤ لشکر سمیت شریک ہونا پڑا----اس موومنٹ کا نقد نتیجہ (NET RESULT) یہ نکلا کہ "اربابِ اقتدار" کے طبقے سے نسبتاً مخلص اور دیندار عناصر کو دیس نکالا مل گیا اور ملکی سیاست کی باگ ڈور زیادہ شاطر اور عیّار لوگوں کے ہاتھ میں آگئی اور پھر وہ افراتفری مچی جس کے نتیجے میں بالآخر فوجی حکومت قائم ہو کر رہی۔

دورِ ایوبی کے اواخر میں مذہبی سیاست نے پھر طاقت پکڑنی شروع کی اور اس بار اس نے دو

کامیاب چھاپے مارے۔ ایک اوائل ۱۹۶۷ء میں عیدالفطر کے موقع پر اور دوسرے اواخر ۱۹۶۸ء میں ڈاکٹر فضل الرحمان کے خلاف ایجی ٹیشن برپا کر کے۔ ان دونوں مواقع پر بھی ملک کے تمام مذہبی عناصر بالکل متّحد تھے اور بالکل ایسا سماں بندھ گیا تھا کہ ایک طرف حکومت اور برسرِاقتدار طبقہ ہے ----- اور دوسری طرف تمام علماء اور "رجالِ دین"۔ گویا یہ پاکستان کی مذہبی سیاست کی متذکرہ بالا منطق کا نقطۂ عروج تھا---!!

لیکن افسوس کہ مذہبی سیاست کے اس عروج کو ع "خوش درخشید ولے شعلۂ مستعجل بُود!" کے مصداق نہایت مختصر عمر ملی اور اواخر ۱۹۶۸ء سے ملکی سیاست ایک بالکل ہی نیا موڑ مڑ گئی۔

اس نئے موڑ کے یوں تو متعدد پہلو ہیں لیکن مذہبی سیاست جس پہلو سے سب سے زیادہ متأثر ہوئی وہ یہ ہے کہ چونکہ ایک طرف سیاسی حکومت کا خاتمہ ہو گیا اور دوسری طرف موجودہ فوجی حکومت نے کسی مستقل حکومت کی شکل اختیار کرنے کی کوشش نہیں کی اور کم از کم تاحال اس نے ایک خالص عبوری اور Care Taker قسم کی حکومت کی صورت اختیار کر رکھی ہے' لہٰذا "اربابِ اقتدار" اور "برسراقتدار طبقہ" ایسی اصطلاحات بے معنی ہو کر رہ گئیں اور اس طرح گویا وہ "ہوائی قلعہ" فضا میں تحلیل ہو کر نگاہوں سے اوجھل ہو گیا جس پر تمام مذہبی جماعتیں متّحد اور متّفق ہو کر حملے کیا کرتی تھیں-----

نتیجتاً ایک جانب وہ اتحاد و اتفاق پارہ پارہ ہو گیا جس کی بنیاد حُبِّ علیؓ کی مثبت اساس کے بجائے بغضِ معاویہؓ کی منفی بنیاد پر قائم تھی----- چنانچہ دو سب سے بڑی اور سب سے زیادہ طاقتور مذہبی جماعتیں یعنی جماعت اسلامی اور جمعیت علماء اسلام ایک دوسرے کے خلاف صف آرا ہو گئیں۔ اور دوسری طرف تصادم کا میدان بدل گیا---اور مقابلہ "رجالِ دین" اور "اربابِ اقتدار" کے مابین نہ رہا بلکہ اس نے عوامی سطح پر مختلف جماعتوں اور گروہوں کے مابین تصادم کی صورت اختیار کر لی' جس میں اصل جتھہ بندی دائیں اور بائیں بازو کے رجحانات کے تحت ہو رہی ہے اور اصل وزن انہی دو پلڑوں میں ہے اور مذہبی جماعتیں پاسنگ کی حیثیت سے ان دونوں اطراف میں بلاواسطہ یا بالواسطہ وزن ڈالنے پر مجبور ہو رہی ہیں!

خالص نظریاتی اعتبار سے تو پاکستانی سیاست کے موجودہ عبوری دَور کو جلد ہی ختم ہو جانا چاہئے اور زیادہ سے زیادہ آئندہ سال کے وسط تک انتخابات اور دستور سازی وغیرہ کے تمام مراحل طے ہو کر عوام کی نمائندہ حکومت کو قائم ہو جانا چاہئے ---- لیکن عملاً جو کچھ نظر آرہا ہے وہ یہ ہے کہ متذکرہ بالا مراحل میں سے ہر مرحلہ نہایت کٹھن ہے اور دستور سازی کی گھاٹی تو تقریباً ناقابلِ عبور ہی ہے ---- بنابریں موجودہ عبوری دور مستقل نہیں تو کم از کم "عارضی مستقل" ضرور ہے ----- اور چاہے کسی کو پسند ہو یا ناپسند جو کچھ نظر آرہا ہے وہ یہ ہے کہ ایک خاصی طویل مدت تک پاکستان میں عوامی کش مکش ہی کا سلسلہ چلتا رہے گا اور "چاروناچار" فوج ہی کو پاکستان کی سوِل ایڈ منسٹریشن کی نگرانی بھی کرنی ہوگی۔ گویا "برسراقتدار طبقہ" کا تصور اب ایک طویل عرصے تک مفقود رہے گا اور مذہبی جماعتوں کے اتحاد و اتفاق کی یہ منفی اساس دوبارہ وجود میں نہ آسکے گی!

تاہم کارکنوں کے لہو کو گرم رکھنا ایک ناگزیر جماعتی ضرورت ہے اور اس کے لئے ایک ایسا ہدف بھی لازم ہے جس پر کارکن مسلسل جھپٹ کر پلٹتے اور پلٹ کر جھپٹتے رہیں۔ چنانچہ اب کی بار ایک جمعیت علمائے اسلام کو چھوڑ کر بقیہ تمام مذہبی جماعتوں نے اپنی مسلسل چاند ماری کے لئے "سوشلزم" کا ہدف منتخب کیا ہے اور تمام مذہبی جماعتوں کے شعلہ بیان مقررین اپنا پورا زورِ خطابت اسی ایک محاذ پر صرف کر رہے ہیں، اور اگرچہ مختلف مذہبی جماعتوں کی مختلف سیاسی جماعتوں سے علانیہ یا درپردہ سازباز کی بنا پر یہ آپس میں ہرگز متحد نہیں بلکہ اندر ہی اندر ایک دوسرے کی کاٹ میں مصروف ہیں، تاہم کم از کم ظاہری اعتبار سے ان سب کا مشترک ہدف "سوشلزم" ہے۔

یہ دوسری بات ہے کہ "برسراقتدار طبقہ" کی طرح یہ تازہ ہدف بھی ہے خالص ہوائی، اس لئے کہ ذرا تجزیہ کرکے دیکھا جائے تو کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ اس ملک میں سوشلزم کے علمبردار ہیں کون لوگ؟ جماعت اسلامی اور پی ڈی پی تو ہوئیں اصلی اور ٹھیٹھ اسلام پسند، تینوں لیگیں بھی اور چاہے جو کچھ بھی ہوں سوشلسٹ بہرحال نہیں، رہے مسٹر بھٹو تو خود وہ اگرچہ "اسلامی سوشلزم" کا راگ الاپتے ہیں لیکن ان کے تمام سیاسی مخالفین سب سے زیادہ زور اسی بات پر دیتے ہیں کہ وہ سوشلسٹ ہرگز نہیں ہیں بلکہ یا تو سی آئی اے کے ایجنٹ ہیں یا صرف ایک فاشسٹ نیشنلسٹ ----

لے دے کے دو نیپیس (NAPS) رہ جاتی ہیں' جنہیں سوشلسٹ کہا جا سکتا ہے۔ تو اول تو ان کا حلقہ اثر ہے ہی کتنا کہ اس قدر شور و ہنگامہ اٹھانے کی ضرورت پڑ گئی' پھر ان میں سے بھی ولی خاں گروپ بنیادی طور پر نیشنلسٹ ہے نہ کہ سوشلسٹ۔

ہاں ایک حقیقت ایسی ہے جسے مانے بغیر چارہ نہیں اور وہ یہ کہ اس ملک کے پڑھے لکھے طبقے ----اور خاص طور پر ان میں سے بھی ذہین تر عنصر میں سوشلسٹ خیالات قابل لحاظ حد تک موجود ہیں اور نوجوان نسل کا خاصا قابل لحاظ حصہ ذہنی اور فکری طور پر اس رو میں بہہ گیا ہے----اور ان دونوں طبقات میں ایک اچھی بھلی تعداد ایسے مخلص انقلابی کارکنوں کی بھی موجود ہے جو اپنے پیش نظر انقلاب کے لئے کبھی ایک اور کبھی دوسرے سیاسی گروہ میں شامل ہو کر کام کرتے رہتے ہیں اور ہمیں اس سے انکار نہیں کہ اگرچہ تعداد کے اعتبار سے یہ لوگ اس ملک میں آٹے میں نمک کے برابر بھی نہیں تاہم اپنے جوش اور جذبۂ کار اور مخصوص انقلابی تکنیک کے اعتبار سے یقیناً قابلِ لحاظ ہیں۔

لیکن اس سلسلے میں بھی دو باتیں سوچنے کی ہیں :

ایک یہ کہ یہ لوگ آخر آئے کہاں سے ہیں' ظاہر ہے کہ نہ روس سے در آمد ہوئے ہیں نہ چین سے ----بلکہ اسی سرزمین کی پیداوار اور اسی قوم کے افراد ہیں----اور خاص طور پر ان کی اصل قوت یعنی نوجوان نسل تو ہے بھی قیام پاکستان کے بعد معرضِ وجود میں آنے والی' تو پھر ان میں اس ذہنی بے راہ روی کے پیدا ہونے کی ذمہ داری کس پر ہے؟----اور کیا یہ ذمہ داری سب سے بڑھ کر ان لوگوں پر عاید نہیں ہوتی جو بزعمِ خویش اس ملک میں اسلامی نظام کے قیام کی علمبرداری فرماتے رہے لیکن جنہوں نے تمام زور "برسراقتدار طبقہ" پر تنقید کرنے میں ضائع کر دیا اور قوتوں' صلاحیتوں اور اوقات کا سارا سرمایہ صرف سیاسی جدّوجہد کے نذر کر دیا اور تعلیم و تربیت کے کام سے یکسر نگاہیں پھیر لیں۔ چنانچہ نہ قوم کی ذہنی و فکری رہنمائی ہو سکی نہ اخلاقی و عملی تربیت' اور صورت یہ ہو گئی کہ نوجوان نسل میں سے جو جتنا زیادہ ذہین تھا اتنا ہی زیادہ تیزی سے الحاد و مادہ پرستی کی جانب جھکتا چلا گیا---- پھر اگر آج یہ نسل خالص مادہ پرستی کی عینک سے معاملات کو دیکھتی ہے تو آخر قصور کس کا ہے؟----دوسرے مذہبی طبقات کو تو چھوڑیئے کہ سب ہی کا خیال ہے کہ ان میں جدید نسل کی ذہنی رہنمائی کی صلاحیت موجود نہیں ، سوال یہ ہے کہ جماعت اسلامی نے پاکستان کے

تیئس سالوں کے دوران کیا کیا؟ حقیقت یہ ہے کہ کسی تحریک کو اتنی طویل مہلتِ کار کا مل جانا بڑی ہی غیر معمولی خوش قسمتی شمار کی جاسکتی ہے۔ اور تاریخ اس جماعت کا یقیناً شدید محاسبہ کرے گی جسے اتنی مہلت ملی لیکن اس نے اپنے آپ کو دور از کار معاملات میں الجھائے رکھا۔۔۔۔ اور سیاسی مہمیں تو چلائیں لیکن نہ ذہن و فکر کی دنیا میں انقلاب برپا کیا اور نہ اخلاق و کردار کی وادیوں میں کوئی تبدیلی پیدا کی۔۔۔۔ چنانچہ اب اپنی ہی "غفلتوں کے شاخسانوں" سے دوچار ہے!

دوسری قابل غور بات یہ ہے کہ کیا اس قسم کی سیاسی ہنگامہ آرائی اور نعرہ بازی سے جیسی کہ آجکل مذہبی طبقات کی طرف سے "سوشلزم" کے مقابلے میں کی جارہی ہے، کوئی مفید نتیجہ نکلنے کی توقع کی جاسکتی ہے؟ اس لئے کہ یہ تو شاید ممکن ہو کہ اس طرح ان سیاسی جماعتوں کی پیش قدمی کو آپ کچھ دیر کے لئے روک دیں جو اپنی حصول اقتدار کی جنگ میں پیٹ کے نعرے کو اچھال رہی ہیں لیکن اس کی ہرگز کوئی امید نہیں کی جاسکتی کہ اس طریقے پر کسی ایک ذہن کو بھی بدلا جاسکے۔۔۔۔ اور کسی ایک شخص کے فکر کے رخ کو بھی تبدیل کیا جاسکے۔ گویا یہ سارا "جہاد" ان لوگوں کے خلاف تو شاید کسی حد تک نتیجہ خیز ثابت ہو سکے جنہیں "Pseudo Socialist" کہا جاتا ہے، لیکن جو لوگ حقیقتاً سوشلسٹ ہیں اور جن کی زندگی کا مقصد ہی سوشلسٹ اور کمیونسٹ انقلاب برپا کرنا ہے اور جو واقعتاً موجودہ انقلابی رو کی ذہنی و فکری رہنمائی کر رہے ہیں ان کے خلاف یہ ساری مہم قطعاً لاحاصل اور بے کارِ محض ہے۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ اس طرز کی نعرہ بازی سے ایسے لوگ اپنے موقف پر مزید جازم اور اپنے نقطہ نظر میں مزید پختہ ہوتے چلے جارہے ہیں اور دین و مذہب رہا سہا اخلاقی وقار بھی خاک میں ملتا چلا جارہا ہے۔

ہمیں خوب معلوم ہے کہ ہماری اس بار بار کی مرثیہ خوانی کا حاصل کچھ بھی نہیں، اس لئے کہ ملکی سیاست کے میدان میں برسرکار مذہبی جماعتوں کے لئے اب طریق کار کی تبدیلی قطعاً ناممکن ہے۔ ان کی ایک بڑی تعداد تو جو کچھ کر رہی ہے اس کے سوا اور کچھ کر ہی نہیں سکتی۔ جن سے توقع ہو سکتی تھی وہ خود ہی اپنی غلط منطق کے صغریٰ کبریٰ کے جال میں اس درجہ پھنس چکے ہیں کہ اب اس سے ان کا رہائی پانا ممکن نہیں رہا۔ بنابریں اکثر گمان ہوتا ہے کہ ہماری ساری قیل و قال بیکار اور سعیٔ لاحاصل ہے۔

لیکن پھر خیال آتا ہے کہ کیا واقعی اتنے بڑے ملک اور اتنی عظیم قوم میں چند لوگ بھی ایسے

نہیں جو وقتی طور پر سیاست کے اتار چڑھاؤ سے صرفِ نظر کر کے دین و مذہب کی بنیادی اقدار کے احیاء کے لئے بالکل بنیادی اور اساسی کام میں منہمک ہو سکیں ---- تو دل گواہی دیتا ہے کہ ایسا نہیں ہو سکتا۔ غالباً ساری کمی ہمارے اپنے جذبِ دروں کی' اور اصل کوتاہی ہمارے بیانِ مطلب اور ادائے مدّعا کی ہے اور اس کے لئے اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ بارگاہِ ایزدی ہی میں درخواست کی جائے کہ "رَبِّ اشْرَحْ لِي صَدْرِي وَيَسِّرْ لِي أَمْرِي وَاحْلُلْ عُقْدَةً مِّن لِّسَانِي يَفْقَهُوا قَوْلِي ---!"

ہمارے اسی باطنی اضطراب کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ بار بار خیال آتا ہے کہ "میثاق" کو بند کر دیا جائے تاکہ سیاسی میدان سے بالکل لاتعلق ہونے کے باوجود محض اس کے صفحات میں جو سیاسی تبصرے کبھی کبھی آجاتے ہیں ان کا سلسلہ بھی بند ہو جائے اور ہم اپنی صلاحیتوں کی حقیری پونجی کو کامل یکسوئی کے ساتھ صرف علومِ قرآنی کی نشر و اشاعت اور تعلیم و تعلّمِ قرآن میں کھپا دیں۔ تاہم ابھی کچھ نہیں کہا جاسکتا کہ کیا ہو گا۔

دیکھئے اس بحر کی تہ سے اچھلتا ہے کیا
گنبدِ نیلو فری رنگ بدلتا ہے کیا!

اعزازی خطابت کی پیشکش

ڈگری کالج کے ایک پروفیسر جو ڈبل ایم اے ہیں اور جن کا تعلق جناب ڈاکٹر اسرار احمد مدظلہ' کے حلقہ اثر سے ہے' لاہور یا گوجرانوالہ ڈویژن میں رفقاء تنظیم اسلامی یا انجمن خدام القرآن کے زیر انتظام یا زیر اثر کسی مسجد میں خطاب جمعہ کی اعزازی خدمت سرانجام دینا چاہتے ہیں۔

رابطہ کے لئے : معرفت حافظ خالد محمود خضر

قرآن اکیڈمی' K-36 کے ماڈل ٹاؤن لاہور فون : 3-5869501

باب نہم

"......وقتِ دُعا ہے!"

دسمبر ۱۹۷۱ء

ان سطور کی تحریر کے وقت مشرقی پاکستان پر بھارت کا باقاعدہ حملہ شروع ہوئے بیس روز ہو چکے ہیں اور مغربی پاکستان اور بھارت کے مابین جنگ شروع ہوئے بھی آٹھ دن ہو چکے ہیں۔ اور اس وقت دونوں محاذوں پر میدانی جنگ بھی نہایت گھمسان کی ہو رہی ہے اور دونوں ملکوں کی بحری و فضائی قوتوں میں بھی خوفناک ٹکراؤ جاری ہے ----- ادھر اقوامِ متّحدہ میں بھی گفت و شنید کا سلسلہ چل رہا ہے اور دنیا بھر کے تمام اہم دارالسلطنتوں کی توجّہات بھی برِّ صغیر پر مرتکز ہیں۔

کل کیا ہوگا وہ "وَمَا تَدْرِي نَفْسٌ مَّاذَا تَكْسِبُ غَدًا" {۱} کے مصداق کسی کو معلوم نہیں اور اس جنگ کا مجموعی نتیجہ کیا نکلے گا وہ بھی "وَاَنَّا لَا نَدْرِیْ اَشَرٌّ اُرِيْدَ بِمَنْ فِی الْاَرْضِ اَمْ اَرَادَ بِهِمْ رَبُّهُمْ رَشَدًا" {۲} کے مصداق کسی کے علم میں نہیں !---- حتیٰ کہ یہ کہنا بھی ممکن نہیں کہ جنگ کے خاتمے سے قبل یہ سطور بھی طبع ہو کر قارئین تک پہنچ پاتی ہیں یا نہیں!

تاہم ایک بات بالکل واضح ہے کہ پاکستان کے وجود اور بقا کے لئے یہ جنگ فیصلہ کن ہے اور ہر پاکستانی مسلمان کے لئے یہ وقت جان کی بازی کھیل جانے کا ہے، اور ساتھ ہی چونکہ پاکستان کا قیام بھی اللہ تعالیٰ کا ایک خصوصی فضل ہی تھا اور اس کا اب تک قائم رہنا بھی اسی کے رحم و کرم کا نتیجہ ہے لہٰذا ہر پاکستانی کو بارگاہ خداوندی میں صدقِ دل سے دعا بھی کرنی چاہئے۔

لیکن واضح رہنا چاہئے کہ دعا بس کچھ رٹے ہوئے الفاظ کے زبانوں سے ادا کر دینے کا نام نہیں

{۱} "اور نہیں جانتا کوئی ذی نفس کہ وہ کل کو کیا کمائے گا"۔ (سورۂ لقمان، آیت ۳۴)

{۲} "اور ہم نہیں جانتے کہ زمین والوں کی شامت آگئی ہے یا ان کا رب ان پر کرم فرمائی کا ارادہ رکھتا ہے"۔ (سورۂ جن، آیت ۱۰)

ہے بلکہ اس کے لئے لازم ہے کہ ہر وہ شخص جو خدا کی رحمت کو پکارنا اور اس کی تائید و نصرت کو آواز دینا چاہے' پہلے اپنے گریبان میں منہ ڈال کر دیکھے کہ خود اس نے اپنے پروردگار سے کوئی وفادارانہ رشتہ بھی استوار کیا یا نہیں؟ اور خود اس نے اس کے دین کے ساتھ خلوص و اخلاص کا معاملہ کیا یا نہیں؟۔ اس لئے کہ اللہ تعالیٰ کا تو واضح فرمان یہ ہے کہ "اِنْ تَنْصُرُوا اللّٰهَ يَنْصُرْكُمْ وَيُثَبِّتْ اَقْدَامَكُمْ"{۳}

واقعہ یہ ہے کہ ہم نے پاکستان ایسی نعمتِ غیر مترقبہ اور دولتِ خداداد کی نہ کوئی قدر کی اور نہ ہی اس کا کوئی حق ادا کیا اور ہم بحیثیتِ قوم عدالتِ خداوندی میں مجرموں کے کٹہرے میں کھڑے ہیں اور اب بھی کوئی آثار ایسے موجود نہیں کہ یہ امید کی جاسکے کہ ہماری اجتماعی زندگی کا دھارا دین کی طرف مڑ سکے گا۔

ان حالات میں ظاہر ہے کہ کوئی بھی فرد اس پوزیشن میں نہیں کہ پوری قوم کی جانب سے بارگاہِ خداوندی میں "اِنَّا هُدْنَا اِلَيْكَ"{۴} کا توبہ نامہ پیش کر کے "اَتُهْلِكُنَا بِمَا فَعَلَ السُّفَهَاءُ مِنَّا"{۵} کی استفہامی درخواست اور دعا پیش کرسکے'----ہاں ایک بات ممکن ہے اور وہ یہ کہ :

> ہر وہ شخص جو واقعتاً صدقِ دل سے خدا کی رحمت کو پکارنا اور اس کی تائید و نصرت کو آواز دینا چاہتا ہو پہلے بارگاہِ خداوندی میں اپنے تمام گناہوں پر صدقِ دل سے اظہارِ ندامت بھی کرے اور عزمِ توبہ بھی! اور پھر یہ عہد کرے کہ کم از کم اس کی اپنی زندگی اور اس کے بیشتر اوقات اس کے دین کی نصرت کے لئے وقف رہیں گے اور اس کی قوتوں' صلاحیتوں اور توانائیوں کا بہتر اور اکثر حصہ اللہ کی ہدایت

(باقی صفحہ ۸۰ پر ملاحظہ کیجئے)

{۳} "اگر تم اللہ کی مدد کرو گے تو وہ بھی تمہاری مدد کرے گا اور تمہارے قدموں کو جما دے گا"۔ (سورۂ محمدؐ' آیت ۷)

{۴} "ہم تیری جانب رجوع کرتے ہیں"! (سورۂ اعراف' آیت ۱۵۶)

{۵} "کیا تو ہمیں ہمارے ناسمجھ لوگوں کے کرتوتوں کے سبب ہلاک فرمادے گا"۔ (سورۂ اعراف' آیت ۱۵۵)

باب دہم

۶۹ء سے ۷۱ء تک

پاکستانی سیاست کی افراتفری کا اندوہناک نتیجہ

مشرقی پاکستان کی علیحدگی

جنوری فروری ۱۹۷۲ء

دسمبر ۷۱ء کا شمارہ پاک ہند جنگ کے دوران شائع ہوا تھا اور اس کے "تذکرہ و تبصرہ" میں ہم نے "وقتِ دعا ہے.....!" کے عنوان سے عرض کیا تھا کہ

> "کل کیا ہوگا وہ----- "وَمَا تَدْرِیْ نَفْسٌ مَّاذَا تَکْسِبُ غَدًا" کے مصداق کسی کو معلوم نہیں اور اس جنگ کا مجموعی نتیجہ کیا نکلے گا وہ بھی "وَاَنَّا لَا نَدْرِیْٓ اَشَرٌّ اُرِیْدَ بِمَنْ فِی الْاَرْضِ اَمْ اَرَادَ بِهِمْ رَبُّهُمْ رَشَدًا" کے مصداق کسی کے علم میں نہیں ..."

تو اگرچہ ہم ان لوگوں میں سے تو نہیں تھے جو "فتح لازماً ہماری ہو گی!" اور "ہم عید کی نماز دہلی اور کلکتہ میں پڑھیں گے!" کی قسم کی بڑیں ہانکتے تھے، تاہم اس اقرار میں ہمیں کوئی باک محسوس نہیں ہوتا کہ ایسی ذِلّت آمیز شکست کا ہمیں تصور بھی نہیں ہو سکتا تھا۔ چنانچہ مشرقی پاکستان کی مخصوص جغرافیائی پوزیشن کے سبب سے یہ خدشہ تو ہمیں کبھی کبھی ہوتا تھا کہ کہیں مشرقی پاکستان ہماری فوج کا قبرستان نہ بن جائے (چنانچہ مخدومی پروفیسر یوسف سلیم چشتی صاحب نے یاد دلایا کہ بالکل انہی الفاظ میں ایک بار راقم نے اس خدشے کا اظہار ان کے سامنے کیا تھا!) لیکن یہ کبھی تصور میں بھی نہ آ سکتا تھا کہ مشرقی پاکستان عالمِ ارضی کی سب سے بڑی مسلمان مملکت کی عزت و ناموس کی شمشان بھومی کی صورت اختیار کر لے گا اور ایک ایسی فوج کے ایک لاکھ کے لگ بھگ جوان اور افسر انتہائی ذلت کے ساتھ دشمن کے سامنے ہتھیار ڈال دیں گے جس کی شجاعت کا ڈنکا صرف عالمِ اسلام ہی میں نہیں پوری دنیا میں بجتا ہے اور جس کی بہادری کے اپنے ہی نہیں دشمن بھی معترف ہیں۔ (بعد میں معلوم ہوا کہ مشرقی پاکستان سے گرفتار کر کے بھارت لے جائے جانے والے لوگوں میں ریگولر فوجی تینتالیس ہزار (۴۳۰۰۰) تھے' باقی سویلین لوگ تھے!)

بنی اسرائیل کی تاریخ کے دوران کئی بار ایسا ہوا کہ انہیں دشمنوں کے ہاتھوں عبرتناک شکستیں اٹھانی پڑیں۔ تاریخ کے اوراق میں ایسے کئی مواقع کی داستانیں تفصیل کے ساتھ محفوظ ہیں۔ چنانچہ جب کبھی پڑھنے میں آتا کہ اس طرح کے مواقع پر کئی کئی لاکھ کی تعداد میں یہودی مرد عورتیں اور بچے اسیر بنا لئے جاتے تھے تو حیرت ہوتی تھی کہ کیا واقعی ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ ایک قوم ابھی لاکھوں کی تعداد میں موجود ہو لیکن اسیری کی ذلت کو قبول کر لے۔ اور جیسا کہ نبوکد نصر کے حملے کے بعد ہوا' بالکل بھیڑ بکریوں اور ڈھور ڈنگروں کی طرح لاکھوں کی تعداد میں ہنکا کر ایک ملک سے دوسرے کو لے جائی جائے۔۔۔۔ افسوس کہ ملّتِ اسلامیہ پاکستان نے اپنی آنکھوں سے جیتے جی یہ منظر دیکھ لیا کہ اس کے ایک لاکھ کے لگ بھگ کڑیل افراد نے نہ صرف یہ کہ انتہائی ذلت آمیز طریقے پر دشمن کے سامنے ہتھیار ڈالے بلکہ انہیں اس حال میں "بنگلہ دیش" سے بھارت منتقل کیا گیا کہ ان کے ہاتھ پشت پر بندھے ہوئے تھے۔۔۔۔۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیہِ راجِعُون۔

اس حادثۂ فاجعہ پر جو کرب والم نہ صرف مسلمانانِ پاکستان بلکہ مسلمانانِ عالم نے محسوس کیا ہے حقیقت یہ ہے کہ وہ بیان سے باہر ہے۔ کتنے ہی لوگوں کے منہ سے بے ساختہ یہ الفاظ نکلے کہ کاش کہ ہماری فوج ایک ایک کر کے کٹ مرتی لیکن ہتھیار نہ ڈالتی۔ ہر شخص اپنے دل میں رنج و غم کا ایک بند طوفان لئے پھرتا ہے اور پوری قوم کے احساسات میں تلخی کا زہر گھل کر رہ گیا ہے۔

کاش کہ اس موقع پر قوم کو کوئی "زبان" میسر ہوتی جو اس کے احساسات کی ترجمانی کر کے اس کے دل کے بوجھ کو کسی قدر ہلکا کر دیتی۔ قومی اور ملی سطح پر ہماری تہی دامنی کا عالم یہ ہے کہ اِس وقت ہمارے پاس ایسی کوئی "زبان" بھی موجود نہیں۔ بغداد کی تباہی پر جو نوحے شیخ سعدیؒ نے کہے تھے ان سے اس وقت نہ معلوم کتنے لوگوں کے دلوں کا بوجھ ہلکا ہوا ہو گا۔ ان کا یہ شعر جو زبان زدِ خاص و عام ہے ان کے اپنے احساسات کی شدت کا کس درجہ غماز ہے کہ۔

آسماں را حق بود گر خوں ببارد بر زمیں
بر زوالِ ملکِ مستعصم امیر المومنیں

پھر جب دولتِ ہسپانیہ مسلمانوں کے ہاتھوں سے چھنی تو بقول علامہ اقبال مرحوم۔

آسماں نے دولتِ غرناطہ جب برباد کی
ابنِ بدروں کے دلِ ناشاد نے فریاد کی!

پھر جب دہلی پر قیامت ٹوٹی تو علامہ اقبال مرحوم ہی کے الفاظ میں ''داغ رویا خون کے آنسو جہاں آباد پرا'' یہاں تک کہ اسی صدی میں شمالی افریقہ پر یورپی استعمار کے مظالم پر علامہ شبلی مرحوم نے دردناک مرثیے کہے' اور خود علامہ اقبال نے جزیرہ صقلیہ (سسلی) پر بایں الفاظ نوحہ کہا کہ۔

غم نصیب اقبال کو بخشا گیا ماتم ترا
چن لیا تقدیر نے وہ دل کے تھا محرم ترا

لیکن افسوس کہ آج حال یہ ہے کہ روئے ارض کی عظیم ترین مسلمان مملکت پر قیامت گزر گئی' پھر بھی کوئی ایسا نالہ کسی جانب سے سننے میں نہیں آیا جو قوم کی آواز قرار پاتا اور جسے سن کر قوم محسوس کرتی کہ کم از کم اس کے جذبات کا اظہار تو ہو گیا---ان حالات میں بے ساختہ نوکِ قلم پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے وہ الفاظِ مبارک آتے ہیں جو آپ ؐ کی زبان مبارک سے غزوۂ احد کے بعد مدینہ منورہ واپس تشریف لانے پر جوشِ گریہ سے نکلے تھے کہ ''اَمَّا حَمْزَةُ فَلَا بَوَاكِيَ لَهٗ!''--- ''ہائے! حمزہؓ کے لئے رونے والیاں بھی نہیں!'' بالکل اسی طرح حقیقت یہ ہے کہ آج سقوطِ مشرقی پاکستان کا رونے والا بھی کوئی موجود نہیں۔

یہ رونا رلانا' واقعہ یہ ہے کہ محض رسمی نہیں ہوتا بلکہ اس سے حقیقتاً قوم کے دل کی بھڑاس نکل جاتی ہے اور ذہن کا بوجھ ہلکا ہو جاتا ہے۔ ورنہ بسا اوقات اس طرح کے صدمے اندر کی اس بند چوٹ کے مانند جو کسی مریض کو اندر ہی اندر ختم کر دیتی ہے کسی قوم کو بالکل کھوکھلا کر کے رکھ دیتے ہیں اور ہم دیکھ رہے ہیں کہ ''سقوطِ مشرقی پاکستان'' پر قوم کے جذبات کا اظہار نہ ہو سکنے کے باعث اندر ہی اندر کا صدمہ ملتِ اسلامیہ پاکستان کے جذبہ خود اعتمادی کو گھن کی طرح چٹ کر رہا ہے اور عوام کی اکثریت نہ صرف یہ کہ اس طرح کے خیالات میں غلطاں و پیچاں ہے کہ آیا ہماری کوئی حقیقی بنیاد ہے بھی کہ نہیں؟ اور آئندہ بقیہ ملک بھی قائم رہ سکے گا یا نہیں؟ بلکہ لوگ یہاں تک سوچنے لگے ہیں کہ کیا واقعی پاکستان کا قیام درست اور صحیح تھا؟ کہیں ایسا تو نہیں کہ پاکستان کا قیام ہی ایک غلطی ہو اور اب تاریخ کے بے رحم ہاتھ اس غلطی کی جبری اصلاح کے درپے ہو چکے ہوں۔

یہ صورتحال بہت مشابہ ہے اس کیفیت سے جو زلزلے کے کسی جھٹکے کے بعد اعصاب پر طاری ہوتی ہے یعنی یہ کہ انسان ہل کر رہ جاتا ہے اور اسے نہ اپنے نیچے زمین ہی محسوس ہوتی ہے نہ

سر پر آسمان۔ بلکہ یوں معلوم ہوتا ہے کہ جیسے وہ فضا میں معلّق ہو۔ پھر یہ حالت زلزلے کے جھٹکے کے بعد فوراً ختم نہیں ہو جاتی بلکہ دیر تک طاری رہتی ہے' اور انسان بہت دیر تک غیر یقینی کی سی کیفیت میں مبتلا رہتا ہے۔

اس صورتحال میں اس چیز کی شدید ضرورت ہے کہ رنج و الم اور درد و کرب کے احساسات کو زبانِ اظہار عطا کرنے کے ساتھ ساتھ سنجیدگی سے تجزیہ بھی کیا جائے کہ جو کچھ پیش آیا اس کے اسباب کیا تھے۔ حقیقی غلطی کہاں تھی اور کتنی تھی' بلکہ یہ بھی کہ یہ واقعہ جو پیش آیا ہے وہ حقیقت میں ہے کیا؟ اور اس سے ہماری کمزوریاں اور خامیاں ظاہر ہوئی ہیں تو کونسی؟ -------- تاکہ قوم پر بحیثیتِ مجموعی ناامیدی اور مایوسی کی جو کیفیت طاری ہو گئی ہے وہ ختم ہو اور بے اعتمادی اور غیر یقینی کے بادل جو ملک و ملّت کی فضا پر چھا گئے ہیں وہ چھٹ جائیں۔

ہمارے نزدیک "سقوطِ مشرقی پاکستان" ایک حادثہ نہیں بلکہ دو واقعات کا مجموعہ ہے' اور کسی حقیقی تجزیئے کے لئے لازمی ہے کہ ان دونوں پر آغاز ہی سے علیحدہ علیحدہ غور کیا جائے' ان میں سے ایک ہے مشرقی پاکستان کی مغربی پاکستان سے علیحدگی اور وہاں ایک نئی خود مختار مملکت کا "بنگلہ دیش" کے نام سے قیام ---- اور دوسرا ہے پاک ہند جنگ میں پاکستان کی ذلت آمیز شکست اور عبرت ناک ہزیمت۔ ان دونوں حوادث کے جمع ہو جانے اور بیک وقت وقوع پذیر ہونے کو چاہے روایتی طور پر اپنی بدقسمتی پر محمول کر لیا جائے چاہے چند افراد کی نااہلی اور بے تدبیری یا غداری پر' چاہے پوری قوم کی سیاسی بے شعوری اور اجتماعی نابالغی پر' بہرحال یہ حقیقت ہے کہ یہ ہیں دو بالکل جدا حادثات اور انہیں گڈمڈ کرنا کسی طور پر درست نہیں' اس لئے کہ اس حادثے کی اصل تلخی دوسرے جزو سے متعلق ہے نہ کہ پہلے سے!

جہاں تک مشرقی پاکستان کی مغربی پاکستان سے علیحدگی کا تعلق ہے' اس سے پہلے کہ ہم اس واقعے پر اپنا حالیہ "تبصرہ" پیش کریں مناسب ہے کہ آج سے دو ڈھائی سال قبل جولائی ۶۹ء کے "تذکرہ و تبصرہ" میں ہم نے اس مسئلے کے بارے میں جو کچھ لکھا تھا اسے دوبارہ قارئین کی خدمت میں پیش کر دیں۔

اس "تذکرہ و تبصرہ" کا آغاز ہم نے بانی پاکستان محمد علی جناح مرحوم کے اس مشہور فقرے سے کیا تھا کہ :

"GOD HAS GIVEN US A GOLDEN OPPORTUNITY TO SHOW OUR WORTH AS ARCHITECTS OF A NEW STATE AND LET IT NOT BE SAID THAT WE DID NOT PROVE EQUAL TO THE TASK!"

اور اس کے بعد عرض کیا تھا کہ

"افسوس ---- کہ آج جبکہ پاکستان کو قائم ہوئے بائیس سال ہونے کو آئے اور خود محمد علی جناح مرحوم کو اس دنیا سے رخصت ہوئے بیس سال سے زیادہ عرصہ ہو گیا، مملکتِ خداداد پاکستان بزبانِ حال نوحہ خواں ہے کہ اس کے بانی و مؤسس کا خدشہ صحیح ثابت ہوا اور اس نئی مملکت کو وہ معمار میسر نہ آسکے جو ایک انگریز شاعر کے قول کے مطابق "اس کے ستونوں کو نہایت گہری اور پختہ بنیادوں سے اٹھاتے اور پھر تعمیر کرتے ہوئے اوجِ ثریا تک پہنچا دیتے!"

پھر اس صورتحال کا تجزیہ کرتے ہوئے اس کے اسباب میں سے "تین تاریخی عوامل" پر گفتگو کی تھی اور تین ایسی "پیچیدگیوں" کا ذکر کیا تھا جو "قیامِ پاکستان کے ساتھ ہی پیدا ہو گئی تھیں اور گویا پاکستان کی تعمیر ہی میں مضمر ہیں اور جن کا الجھاؤ روز بروز بڑھتا جا رہا ہے ----" اور پھر ان میں سے ایک کے بارے میں عرض کیا تھا کہ :

"ان میں سب سے نمایاں اور اہم ترین پیچیدگی خالص جغرافیائی ہے یعنی یہ کہ مملکتِ خداداد پاکستان دو ایسے علیحدہ اور دُور دراز خطّوں پر مشتمل ہے جو ایک دوسرے سے ایک ہزار میل سے زیادہ فاصلے پر واقع ہوئے ہیں اور جن کے مابین ایک ایسی مملکت حائل ہے جو حالتِ جنگ ہی میں نہیں عین حالتِ امن میں بھی ایک بالقوّہ دشمن (Potential Enemy) کی حیثیت رکھتی ہے اور واقعہ یہ ہے کہ یوں تو اگرچہ پاکستان کا وجود ہر اعتبار سے ایک معجزہ کی حیثیت رکھتا ہے لیکن خاص اس اعتبار ہی سے تو یہ تاریخِ عالم کا ایک نہایت ہی انوکھا اور محیّر العقول تجربہ ہے جس کی شاید ہی کوئی دوسری نظیر کبھی موجود رہی ہو۔

یہ جغرافیائی پیچیدگی بجائے خود بھی کچھ کم اہم اور الجھی ہوئی نہ تھی، لیکن دو مزید عوامل نے اس کے الجھاؤ کو دو گونہ کر دیا ہے ---- یعنی ایک اس حقیقت نے کہ تہذیب، تمدن، زبان، لباس،

طرزِ بُود و باش اور جذباتی و ذہنی ساخت غرض ایک مذہب کے سوا ہر اعتبار سے ان دو خطوں کے رہنے والے ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہیں اور اگر دین و مذہب کے سوال کو خارج از بحث کر دیا جائے تو دنیا کے مروّجہ معیارات میں سے کسی معیار کے اعتبار سے بھی انہیں ایک قوم قرار نہیں دیا جا سکتا ---- اور دوسرے اس واقعے نے کہ ان دو خِطوں میں سے جو خطہ 'رقبہ' محلِ وقوع' دفاع اور تعمیر و ترقی کے امکانات 'الغرض تمام اعتبارات سے اہم تر ہے وہ بلحاظِ آبادی کم تر ہے اور دوسرا خِطہ جو نہ صرف یہ کہ ان تمام اہم امور کے اعتبار سے بہرحال ثانوی حیثیت رکھتا ہے' بلکہ ایک نہایت جاندار' فعّال' سرمایہ دار اور تعلیم یافتہ غرض ہر اعتبار سے نہایت مؤثر لیکن پاکستان کے اساسی نظریئے کی دشمن اور اس کے عین وجود سے بغض و عداوت رکھنے والی اقلیت کی اضافی پیچیدگی بھی لئے ہوئے ہے' تعدادِ نفوسِ انسانی کے لحاظ سے دوسرے خطے سے برتر ہے ---- ذرا دقتِ نظر سے جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ ان دو اضافی عوامل کی بنا پر اس خالص جغرافیائی اشکال نے ایک نہایت پیچیدہ مسئلے کی صورت اختیار کر لی ہے۔

> اور یہ اسی پیچیدگی اور اشکال کا نتیجہ ہے کہ بائیس سال کی طویل مدت میں بھی پاکستان کا کوئی دستور نہیں بن سکا اور دستور سازی کے میدان میں نہ صرف یہ کہ ہنوز روزِ اول کا معاملہ ہے بلکہ واقعہ یہ ہے کہ دور دور تک امید کی کوئی کرن نظر نہیں آتی اور الجھاؤ روز بروز بڑھتا چلا جا رہا ہے!!

اس اشکال اور الجھاؤ کا مستقل حل تو ایک ہی ہے اور وہ یہ کہ دینی جذبات اور ملی احساسات کو مسلسل اجاگر کیا جاتا رہے اور اس جذبہ کے دوام اور تسلسل کا مستقل اور پائیدار بندوبست کیا جائے جو ایک دوسرے سے اتنے بعید اور باہم اس قدر مختلف خطوں کے ایک مملکت میں شامل ہونے کا سبب بنا تھا۔ تاہم فوری طور پر بعض دوسری چیزیں بھی پیش نظر رہنی ضروری ہیں۔

ایک یہ کہ مشرقی اور مغربی پاکستان کے اس "سنجوگ" کا برقرار رہنا مشرقی پاکستان کے عوام کی آزاد مرضی ہی پر منحصر ہے اور اسے کسی طرح بھی ان پر ٹھونسا نہیں جا سکتا۔ بلکہ اس معاملے میں جبر و تشدد کا ردِّ عمل نہایت خوفناک ہو سکتا ہے۔

دوسرے یہ کہ اس "آزاد مرضی" کا انحصار بھی جتنا کچھ دینی جذبات اور ملّی احساسات پر ہے

اتنا ہی اس امر پر بھی ہے کہ نہ صرف یہ کہ وہ یہ محسوس کریں کہ ہمارے ساتھ کوئی ناانصافی نہیں ہو رہی بلکہ مثبت طور پر انہیں یہ احساس بھی ہو کہ خود ان کا مفاد مغربی پاکستان کے ساتھ رہنے ہی سے وابستہ ہے اور مشرقی اور مغربی پاکستان دونوں ایک دوسرے سے پیوستہ رہ کر ہی دنیا میں ایک باعزت اور باوقار آزاد مملکت کی حیثیت سے زندہ رہ سکتے ہیں۔ مزید برآں یہ کہ اگر خدانخواستہ کبھی "علیحدگی" کی صورت پیدا ہوئی تو مغربی پاکستان کے لئے تو پھر بھی امکانِ غالب موجود ہے کہ وہ اپنی آزاد اور باوقار حیثیت کو برقرار رکھ سکے گا' لیکن مشرقی پاکستان کے لئے اس کے سوا اور کوئی چارہ نہ ہوگا کہ کسی دوسری وسیع تر قومیت میں ضم اور کسی دوسری بڑی مملکت میں جذب ہو کر رہ جائے۔

ان دو امور کی روشنی میں جائزہ لیا جانا چاہئے کہ مشرقی پاکستان کے عوام کی مرضی دراصل ہے کیا؟---- اگر وہ واقعتاً مغربی پاکستان سے علیحدہ ہو کر ایک آزاد اور خود مختار حکومت قائم کرنے کے خواہش مند ہیں تو ظاہر ہے کہ دنیا کی کوئی طاقت ان کی اس خواہش کے آڑے نہیں آسکتی۔ بین الانسانی علائق میں سب سے زیادہ مقدس رشتہ میاں اور بیوی کا ہوتا ہے لیکن اس میں بھی دینِ فطرت نے علیحدگی کی ایک سبیل رکھ دی ہے اور صاف ہدایت کی ہے کہ اگرچہ طلاق' حلال چیزوں میں اللہ تعالیٰ کو سب سے زیادہ ناپسند ہے تاہم "معلّق" رکھنے سے بہتر یہی ہے کہ علیحدگی اختیار کر لی جائے ---- بالکل اسی طرح اگر ہمارے مشرقی پاکستانی بھائی واقعتاً یہ محسوس کرتے ہوں کہ مغربی پاکستان کے ساتھ رہنے میں انہیں کوئی فائدہ نہیں بلکہ نقصان ہے تو ان کی بے اطمینانی کے سبب سے پورے ملک کی سیاسی و دستوری زندگی کو مسلسل "معطّل" رکھنے سے بہتر یہ ہے کہ ان کی مرضی کو بروئے کار آنے کا موقع دے دیا جائے۔"

اس قدر طویل اقتباس کی ضرورت اس لئے محسوس ہوئی کہ عام طور پر کہا جاتا ہے کہ کسی حادثے کے وقوع پذیر ہو جانے کے بعد تو ہر شخص ہی "پنڈت" بن جاتا ہے۔ ہمیں افسوس ہے کہ ہم نے اپنی اس تحریر میں اس "اشکال اور الجھاؤ" کے جس مستقل حل کی طرف اشارہ کیا تھا یعنی یہ کہ "دینی جذبات اور ملی احساسات کو مسلسل اجاگر کیا جاتا رہے اور اس جذبے کے دوام اور تسلسل کا مستقل اور پائیدار بندوبست کیا جائے جو ایک دوسرے سے اتنے بعید اور باہم اس قدر مختلف خطوں کے ایک مملکت میں شامل ہونے کا سبب بنا تھا" وہ تو نہ ہونا تھا نہ ہوا۔ البتہ جتنی قابلِ حذر چیزوں کا ذکر ہم نے کیا تھا' شامتِ اعمال سے وہ سب کی سب بدترین صورتوں میں رونما ہو کر رہیں۔

چنانچہ جب یہ کمزور رشتہ کمزور تر ہوتا نظر آیا تو نہ تو "مشرقی پاکستان کے عوام کی آزاد مرضی" کو بروئے کار آنے کا موقع دیا گیا' نہ ان سے سیدھی طرح بات ہی کی گئی' بلکہ اس کے برعکس "جبرو تشدد" کی راہ اختیار کی گئی اور دفعۃً طاقت و قوت کا سخت ترین استعمال کر لیا گیا۔ نتیجتاً اس کا "ردِّ عمل" بھی "نہایت خوفناک" صورت میں سامنے آیا۔ اور آج ہم اس صورتحال سے دوچار ہیں کہ ایک طرف مغربی پاکستان کے عوام کی گردنیں شدید ترین احساسِ ذلّت و رسوائی سے جھکی ہوئی ہیں اور ان کی آنکھوں میں مایوسی اور دل شکستگی کے مہیب سائے ڈیرہ ڈالے نظر آتے ہیں اور دوسری طرف وہ حسین و زرخیز اور سرسبز و شاداب خطہ جسے دنیا ربع صدی تک "مشرقی پاکستان" کے نام سے جانتی رہی ہے نہ صرف یہ کہ ہم سے کٹ گیا ہے بلکہ اِس وقت دشمن کے قبضے میں ہے اور اس بات کا حقیقی خطرہ موجود ہے کہ کہیں وہ مستقل طور پر "مہابھارت" میں "ضم" اور ہندی قومیت میں "جذب" ہو کر نہ رہ جائے۔ (پ۔ن : واقعہ یہ ہے کہ یہ اللہ کے بہت بڑے فضل و کرم کا مظہر ہے کہ ہمارے یہ اندیشے غلط ثابت ہوئے اور آج بحمد اللہ بنگلہ دیش ایک آزاد و خود مختار ملک کی حیثیت سے موجود ہے' جہاں نہ صرف یہ کہ مسلمان عظیم اکثریت میں ہیں بلکہ دینی احساسات کے اعتبار سے بھی دنیا کے کسی اور خطے کے مسلمانوں سے پیچھے یا کم تر نہیں ہیں!)

حقیقت یہ ہے کہ دسمبر ۷۰ء کے عام انتخابات کے بعد پاکستان میں جو حالات و واقعات رونما ہوئے وہ ہمارے سابق حکمران ٹولے کی شدید نااہلی اور انتہائی بے بصیرتی و بے تدبیری حتیٰ کہ بدنیتی اور بددیانتی کے شاہکار تو ہیں ہی' مجموعی اعتبار سے ہماری پوری قوم کے سیاسی افلاس کا بھی منہ بولتا ثبوت ہیں.... ہم نے گزشتہ پورے سال کے دوران اس موضوع پر بالکل قلم نہیں اٹھایا کہ مارشل لاء کی تلوار سر پر لٹکی ہوئی تھی اور زبان و قلم پر سخت پہرے قائم تھے۔ چنانچہ ستمبر اکتوبر ۷۱ء کے "تذکرہ و تبصرہ" میں ہم نے عرض بھی کر دیا تھا کہ :

> "جہاں تک ملکی حالات کا تعلق ہے ان پر کچھ لکھنے پر ابھی طبیعت بالکل آمادہ نہیں ہوتی۔ اس لئے کہ بحالاتِ موجودہ "پورا سچ" (Whole Truth) کہنا ممکن نہیں اور جزوی صداقت (Half Truth) کے بارے میں ہماری رائے یہ کہ وہ بسا اوقات جھوٹ اور کذب کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔ لہٰذا جب تک قلم غیر معمولی حالات کی بنا پر عاید شدہ پابندیوں سے آزاد نہیں ہو جاتا ہم منقار زیرِ پر رہنے ہی کو ترجیح دیتے ہیں...."

ہماری حتمی رائے جو مندرجہ بالا اقتباس کے بین السطور میں بھی موجود ہے' یہ ہے کہ پاکستان کے مشرقی اور مغربی خطوں کو ابتدا ہی سے ایک ملک متصور کر کے سفر کا آغاز اگرچہ نہایت خلوص کے ساتھ اور "IN ABSOLUTE GOOD FAITH" ہوا تھا تاہم تھی یہ ایک غلطی۔ اس کے برعکس صحیح شکل وہی تھی جس کی جانب مشہور و معروف "قرار دادِ لاہور" میں اشارہ کیا گیا تھا یعنی یہ کہ جغرافیائی حقائق کا منہ چڑانے کی بجائے ان کا مناسب لحاظ کیا جاتا اور ان دونوں خطوں کو ابتدا ہی سے دو آزاد اور خود مختار ملک تصور کر کے سفر کا آغاز کیا جاتا۔ اس صورت میں غالب امکان یہی تھا کہ ایک طرف تو یہ دونوں ملک بھارت کی مشترک دشمنی کے زیر اثر آپ سے آپ بغیر کسی بیرونی دباؤ کے ایک دوسرے کے ساتھ نہایت قریبی تعاون اور اشتراکِ عمل رکھنے پر مجبور ہوتے اور دوسری طرف مشرقی پاکستان میں مقامی ہندو سرمایہ داروں کے غریب مسلمان عوام کے معاشی استحصال کا وہ احساس و شعور بھی برقرار رہتا جو پاکستان کے وجود میں آنے کا اصل اور بنیادی محرک بنا تھا۔ لیکن افسوس کہ ہم بحیثیتِ قوم چاہے خالص عارضی اور محض وقتی طور پر ہی سہی بہرحال آزادیٔ ہند سے متصلاً قبل کے زمانہ میں "جذبۂ ملی" سے اس درجہ سرشار ہو گئے تھے کہ نہایت ٹھوس حقائق بھی ہماری نگاہوں سے اوجھل ہو گئے اور ہم نے ان دونوں دور دراز خطوں کا "سنجوگ" ایک متحدہ ملک کی صورت میں قائم کر دیا۔ یہ دراصل قومی سطح پر ہمارے سیاسی افلاس کا نہایت نمایاں مظہر اور ہمارے قومی مزاج کی "جذباتیت" کا منہ بولتا ثبوت تھا۔

واقعہ یہ ہے کہ اگر بحیثیتِ قوم ہم میں کچھ بھی سیاسی شعور ہوتا تو ہم بہت جلد اس غلطی کا احساس و ادراک کر لیتے۔ اس لئے کہ خان لیاقت علی خان مرحوم کی بی پی سی رپورٹ کا حد درجہ حسرتناک انجام اسی لئے ہوا تھا کہ پاکستان کے مشرقی اور مغربی خطوں کے مابین بندھن کے لئے کوئی قابلِ قبول دستوری فارمولا تلاش نہ کیا جا سکا۔ لیکن ہماری "جذباتیت" اور حقائق سے گریز کی مستقل عادت پھر آڑے آئی اور ہم نے حقائق کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔

اس کے بعد پاکستان میں حکومت کی سطح پر سازشوں اور انقلابوں کا جو چکر چلا اس کا اصل اور بنیادی سبب تو اگرچہ یہ تھا کہ یہاں جو قوم آباد تھی وہ دفعتہً آزاد تو ہو گئی تھی لیکن اس کا سیاسی و اجتماعی شعور ابھی بالکل خام تھا اور یہاں قومی سطح پر نہ کوئی محکم تنظیم موجود تھی نہ مضبوط قیادت' لیکن اس کا ایک اہم سبب یہ بھی تھا کہ جب ملک کی کوئی دستوری اساس ہی قائم نہ ہو سکی تو لامحالہ ؏

"خموشی گفتگو ہے' بے زبانی ہے زباں میری!" کے مصداق بے دستوری ہی یہاں کا دستور اور بے آئینی ہی یہاں کا آئین قرار پایا۔ چنانچہ ملک و ملت کا سفینہ کچھ عرصہ تو سازشوں اور انقلابوں کے چھوٹے چھوٹے گردابوں میں ہچکولے کھاتا رہا اور بالآخر ایک بڑے بھنور میں آ پھنسا۔ اور ایوب خاں کا گیارہ سالہ "سنہری دور" شروع ہو گیا' جس کے دوران میں "صدارتی طرز حکومت" نے مشرقی پاکستان کے لوگوں کے سیاسی محرومی کے احساس کو نقطہ عروج پر پہنچا دیا۔

اس میں شک نہیں کہ دورِ ایوبی میں مشرقی پاکستان میں صنعتی ترقی وغیرہ کی صورتوں میں وہاں کے عوام کی اشک شوئی اور دلجوئی کی بہت کوششیں بھی ہوئیں' لیکن اس کو تسلیم کئے بغیر چارہ نہیں کہ ان تمام کوششوں کے علی الرغم رفتہ رفتہ مشرقی پاکستان واقعتاً مغربی پاکستان کی "نو آبادی" (Colony) بنتا چلا گیا' جس سے وہاں فطری طور پر سیاسی بے چینی مسلسل بڑھتی چلی گئی۔

اس صورتحال سے دشمن نے بھرپور فائدہ اٹھایا۔ چنانچہ ایک طرف مشرقی پاکستان کی اس ہندو اقلیت نے جلتی پر تیل ڈالا جو خود ہمارے الفاظ میں "نہایت جاندار' فعال' سرمایہ دار اور تعلیم یافتہ' غرض ہر اعتبار سے نہایت مؤثر لیکن پاکستان کے اساسی نظریئے کی دشمن اور اس کے عین وجود سے بغض و عداوت رکھنے والی تھی"۔ اور جو وہاں زبان اور کلچر کی بنیاد پر جداگانہ قومیت کی اساس کو اجاگر کرنے کا کام بھی مسلسل بیس سال سے کر رہی تھی۔ ہندوؤں کو ابھی اس نہج پر کام کر کے کسی نتیجے پر پہنچنے میں یقیناً بہت مدت تک جدوجہد کرنی پڑتی لیکن اس سیاسی بے چینی نے ان کے لئے ایک سنہری موقع فراہم کر دیا اور انہوں نے سیاسی محرومی کے احساس کو بآسانی مغربی پاکستان کے خلاف جذبۂ نفرت (Hate Complex) میں تبدیل کر دیا۔ اور دوسری طرف ہمارے "عظیم ہمسائے" نے اس آگ کو نہ صرف ہوا دی اور بھڑکایا بلکہ اس کے لئے ہر طرح کا ایندھن بھی فراہم کیا۔۔۔۔ نتیجتاً علیحدگی پسندی کا ایک زبردست رجحان پیدا ہوا اور اس کے لئے ایک عوامی تحریک جڑ پکڑ گئی۔

۶۹ء میں دوسرے مارشل لاء کے نفاذ کے بعد اگرچہ حکومتِ وقت نے بہت سی ہمالیہ ایسی غلطیاں بھی کیں' مثلاً یہ کہ مغربی پاکستان کی وحدت کو بلاوجہ ختم کر دیا' تاہم دسمبر ۷۰ء کے انتخابات کے بعد تک بحیثیتِ مجموعی سابق صدر یحییٰ کی نیک نیتی پر شک کے لئے کوئی گنجائش موجود نہ تھی اور ان کا ملک کو ہنگاموں اور ایجی ٹیشنوں کی فضا سے نکال کر معروف سیاسی سرگرمی حتیٰ کہ عام

انتخابات کی راہ پر لے آنے میں کامیاب ہو جانا تو بلاشبہ بہت قابلِ قدر تھا' لیکن اس کے بعد کی داستان نہایت تلخ ہے' اور جیسا کہ ہم عرض کر چکے ہیں حکمران ٹولے کی شدید نااہلی اور انتہائی بے بصیرتی اور بے تدبیری ہی نہیں بدنیتی اور بددیانتی کا عظیم شاہکار ہے۔ اور یہی وہ مقام ہے جہاں سے "سقوطِ مشرقی پاکستان" کے اصل تلخ جزو یعنی ہماری ذلت آمیز شکست اور عبرتناک ذلت و رسوائی کے اسباب کا آغاز ہوتا ہے۔

دسمبر ۷۰ء کے انتخابات کے نتائج سے یہ بات بالکل واضح ہو گئی تھی کہ مشرقی پاکستان نے بحیثیتِ مجموعی علیحدگی پسندگی کے حق میں واضح فیصلہ صادر کر دیا ہے۔ اب ضرورت اس بات کی تھی کہ ان کی آزاد رائے کو عملاً بروئے کار آنے کا موقع دیا جاتا یا کم از کم یہ کہ ان سے واضح انداز میں بات کی جاتی اور یہ سمجھنے کی کوشش کی جاتی کہ حقیقتاً وہ چاہتے کیا ہیں؟ آیا مغربی پاکستان سے مکمل علیحدگی کے خواہاں ہیں یا کسی درجے کا کوئی بندھن قائم رکھنے پر آمادہ ہو سکتے ہیں۔ راقم نے انتخابات کے نتائج مدینہ منورہ میں سنے تھے اور اسی وقت احباب سے عرض کر دیا تھا کہ اب مشرقی اور مغربی پاکستان کو کوئی طاقت ساتھ نہیں رکھ سکتی۔ زیادہ سے زیادہ جو کچھ ہو سکتا ہے وہ یہ ہے کہ ؎

ہر چہ دانا کند ' کند ناداں
لیک بعد از خرابئ بسیار!

کے مصداق یہ علیحدگی خوش اسلوبی سے نہ ہو بلکہ بھونڈے طریق پر ہو اور صرف خرابی ہی نہیں خون خرابے کے ساتھ ہو۔ ساتھ ہی بارگاہِ ربّ العزت میں دعا بھی کی تھی کہ "پروردگار! پاکستان کے موجودہ فوجی حکمرانوں کو جنرل ڈیگال ہی کی سمجھ عطا فرما دے کہ وہ اس علیحدگی کو خوش اسلوبی کے ساتھ عمل میں لے آئیں!" لیکن افسوس کہ ہماری یہ دعا بارگاہِ ربّ العزت میں قبول نہ ہوئی اور قوم کے سیاسی افلاس اور اجتماعی شعور کے فقدان کے نتائج سامنے آ کر رہے۔

اب یہ بات یقینی طور پر معلوم ہے کہ سابق صدر یحییٰ خان اور ان کے مشیروں کا "عام انتخابات" کے انعقاد کا کریڈٹ حاصل کرنے کا فیصلہ اس غلط اندازے پر مبنی تھا کہ دونوں خِطّوں میں چاہے کچھ بڑے بڑے گروپ بھی انتخابات جیت لیں لیکن اکثریت چھوٹے چھوٹے سیاسی گروپوں کی ہو گی جن کو مہرے بنا کر ہم سیاست کی شطرنج پر بازی کھیلتے رہیں گے۔ لیکن کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ یہ خوش قسمتی تھی یا بدقسمتی کہ ان کے یہ اندازے غلط ثابت ہوئے۔ مغربی پاکستان میں تو پھر بھی

پیپلز پارٹی کے بڑے دھڑے کے ساتھ کچھ نہ کچھ چھوٹے گروپ بھی آگئے' لیکن مشرقی پاکستان میں تو ساری کی ساری سیٹیں عوامی لیگ نے حاصل کرلیں اور اس طرح شطرنج کی کسی بساط کے بچھنے کا امکان ہی موجود نہ رہا۔

بس یہیں سے بدنیتی کے اس سلسلے کا آغاز ہو گیا جو بالآخر انتہائی ذلّت و رسوائی پر منتج ہوا۔ پہلے تو تین ماہ شش وپنج ہی میں گزار دیئے گئے' پھر اسمبلی کا اجلاس طلب بھی کیا گیا تو اس پیشگی اہتمام کے ساتھ کہ وہ بالفعل منعقد نہ ہونے پائے۔

اس مرحلہ پر پاکستان کے موجودہ صدر مملکت اور چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر ذوالفقار علی بھٹو کا کردار بھی نہایت مشکوک اور حد درجہ تباہ کن ثابت ہوا۔۔۔ اور اب چاہے بھٹو صاحب اپنے اُس وقت کے موقف کی کیسی ہی خوشنما تاویلیں کرلیں حقیقت یہ ہے کہ یہ داغ ان کے دامن پر ہمیشہ قائم رہے گا کہ چاہے دانستہ اس سازش میں شریک نہ رہے ہوں اور محض نادانستہ ہی استعمال ہوئے ہوں بہرحال ایک بہت بڑی تباہی کے اسباب میں شامل ضرور ہو گئے۔ ان کے بارے میں ہمارا اندازہ یہ تھا کہ ان کی جذباتی' سیماب وش' جلد باز اور Volatile شخصیت کے ظاہری خول کے اندر ایک سنجیدہ' حقیقت بین اور ٹھوس Calculating شخصیت چھپی ہوئی ہے لیکن افسوس کہ مشرقی پاکستان کے معاملے میں انہوں نے کسی تدبّر اور معاملہ فہمی کا ثبوت نہیں دیا۔

اس مسئلے میں تھوڑا سا الزام ہماری رائے میں مغربی پاکستان کے دائیں بازو کے ان شکست خوردہ سیاست دانوں پر بھی آتا ہے جنہوں نے انتخابات کے فوراً بعد بھٹو دشمنی کے جذبات سے مغلوب ہو کر شیخ مجیب الرحمٰن کی مدح سرائی اور کاسہ لیسی شروع کردی اور اس طرح گویا بھٹو صاحب کو بالکل corner کر دینے کی کوششیں شروع کردیں۔ ہمارے نزدیک یہ ان لوگوں کی بے تدبیری اور ناسمجھی کا بہت بڑا ثبوت تھا۔ لیکن اگر بھٹو صاحب کا رویّہ ان کے اس طرز عمل کے ردِ عمل کے طور پر تھا تب بھی یہ بھٹو صاحب کے اپنے فہم اور تدبّر کے دامن پر ایک بہت بڑا داغ ہے۔

بہرحال اسمبلی کے انتہائی تاخیر کے ساتھ طلب کیے جانے اور پھر ملتوی کردیئے جانے کا نتیجہ یہ نکلا کہ مشرقی پاکستان کے لوگوں نے محسوس کیا کہ ہم اپنا مقصود آئینی طریق پر حاصل نہیں کرسکتے۔ چنانچہ حالات بگڑنے شروع ہوئے' قتل وغارت اور لوٹ مار کا بازار گرم ہوا' جس پر پہلے تو حکومتِ

وقت نے نہایت پر اسرار خاموشی اختیار کی اور پھر یکبارگی سخت ترین ملٹری ایکشن کا آغاز کر دیا۔

اس کے بعد کی داستان بہت طویل ہے' اور داستان سرائی یہاں مقصود نہیں۔ مختصراً یہ کہ ملٹری ایکشن کے نتیجے میں لاکھوں افراد گھربار چھوڑ کر بھارت بھاگ گئے جسے بھارت نے اپنا مسئلہ بنا لیا۔ اور اس کے پردے میں پہلے گوریلے اور مسلّح تخریب کار بھیج کر اور پھر براہ راست حملہ کر کے مشرقی پاکستان کے لئے فوری خطرہ پیدا کر دیا اور پھر وہ چودہ روزہ جنگ ہوئی جس کے نتیجے میں پاکستان کو ذلت آمیز شکست اٹھانی پڑی اور مشرقی پاکستان "بنگلہ دیش" بن گیا۔

جہاں تک اس "ذِلّت آمیز شکست" اور "عبرتناک ہزیمت" کے اسباب کا تعلّق ہے اب تک اس موضوع پر بہت کچھ کہا اور لکھا جا چکا ہے۔ تقریباً ڈیڑھ ماہ سے یہی ہمارے عوام کی گفتگوؤں کا موضوع بھی رہا ہے اور "دانشوروں" کے تجزیوں کا بھی۔ اور اب تو اس قضیئے کے باقاعدہ تصفیے کے لئے ایک اعلیٰ سطح کا کمیشن بھی کام کر رہا ہے۔ تاہم اس مسئلے کے بعض پہلو ایسے ہیں جو عوام کی نظروں سے تو اوجھل ہیں ہی' ہمارے علم کی حد تک "دانشوروں" نے بھی کم از کم تاحال دانستہ یا نادانستہ ان سے اعراض ہی کیا ہے۔ رہا حمود الرحمٰن کمیشن تو غالباً یہ پہلو اس کے دائرۂ تحقیق و تفتیش (Scope) سے بھی باہر ہی رہیں گے۔ لہٰذا ہماری رائے میں ان صفحات میں ان کے جانب مختصر اشارہ مناسب رہے گا۔

اب تک جو کچھ کہا اور لکھا گیا ہے اس کا مرکز و محور سابق صدر یحییٰ خان اور اُن کے رفقائے کار فوجی حکمران رہے ہیں۔ اور اس میں کوئی شک بھی نہیں کہ اس شکست کے فوری اسباب (Exciting Causes) بہرحال ان لوگوں کی شدید ترین نااہلی' حد درجہ کی بے تدبیری اور بے بصیرتی' حوصلے کی کمی' قوت فیصلہ کے فقدان اور اعصاب کے ضعف کے گرد ہی گھومتے ہیں۔ اور یہ تمام چیزیں براہ راست نتیجہ ہیں ان کی عیاشیوں اور بدکاریوں کا اور ان کے کردار کی پستی' اخلاق کی دناءت اور سیرت کے گھناؤنے پن کا۔ خمر تو کہتے ہی اسے ہیں جو عقل کو ڈھانپ لے (الخمرُ ما یُخامِرُ العقل) لہٰذا ہمارے ان حکمرانوں کی سمجھ بوجھ اور معاملہ فہمی تو اس راہ سے رخصت ہوئی۔ رہی ہمت و جرأت اور حوصلہ و ارادہ تو ان سب کا جنازہ بدکاریوں نے نکال دیا۔

نتیجہ یہ نکلا کہ نہ صرف یہ کہ یہ لوگ خود بتاشے کی طرح بیٹھ گئے بلکہ ساتھ ہی ایک پوری قوم بلکہ روئے ارض کی پوری امتِ مسلمہ کی عزت وناموس کا دھیلہ کر گئے۔

لیکن، جیسا کہ ہم نے اوپر عرض کیا، یہ سب شکست کے صرف فوری اسباب ہیں اور اس بحر کی گہرائیوں میں "ظُلُمَاتٌ بَعْضُهَا فَوْقَ بَعْضٍ" کے مصداق تہہ بر تہہ تاریکیاں موجود ہیں اور صرف سطح آب پر چمکنے والی چیزوں پر نگاہ رکھنا اور گہرائیوں میں اتر کر حقائق کا مواجہہ کرنے سے گریز کرنا بھی من جملہ ان بیماریوں کے ہے جو ہمیں اندر ہی اندر گھن کی طرح کھائے جا رہی ہیں۔ اس لئے کہ یہ درحقیقت قومی سطح پر گریز اور فراریت کا وہ مرض ہے جس نے پوری قوم کا مزاج اس طرز پر ڈھال دیا ہے کہ ہر ناکامی اور ہر خرابی کی ساری ذمہ داری کسی ایک یا چند افراد یا کسی ایسے گروہ یا طبقے کے سر تھوپ کر پوری قوم اپنی جگہ مطمئن ہو جائے اور بڑی سے بڑی ناکامی پر نہ اس کا اجتماعی شعور بیدار ہو، نہ اسے اپنی خامیوں اور کوتاہیوں کا احساس وادراک ہو سکے اور نہ ہی اس کے قومی ضمیر میں کوئی خلش یا چبھن پیدا ہو۔ اس صورتحال کی ذمہ داری سب سے بڑھ کر دانشوروں اور خصوصاً صحافیوں پر عائد ہوتی ہے کہ ان کا دماغ اور قلم اکثر و بیشتر قوم کے اجتماعی شعور کو تھپک تھپک کر اور لوریاں دے دے کر سلانے ہی کا کام کرتا ہے۔ اب یہ اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ یہ اس طبقے کے فہم وادراک کے قصور کا نتیجہ ہے یا مصلحت بینی اور عافیت کوشی کا ثمرہ۔ اس لئے کہ اس دور میں اصل "سلطانِ جائر" عوام ہیں اور ان کے سامنے "کلمۂ حق" کہنا --- "لانا ہے جوئے شیر کا!"

ہمارے نزدیک ہماری ذلت آمیز شکست کے متذکرہ بالا فوری اسباب اور سطحی سبب کے نیچے کے تہہ در تہہ اسباب میں سے پہلا سبب یہ ہے کہ نہ صرف اس جنگ بلکہ اس پورے قضیئے میں ہمارا سرے سے کوئی اخلاقی موقف ہی موجود نہ تھا، بلکہ جیسا کہ ہم پہلے لکھ چکے ہیں دسمبر ۷۰ء کے عام انتخابات کے انعقاد کے بعد جو کچھ ہوا وہ سب بڑی دھاندلی اور صریح بددیانتی پر مبنی تھا۔ نتیجتاً چاہے ہم خود اپنے ضمیر کی آواز کو دبانے میں کتنے ہی کامیاب ہو گئے ہوں بہرحال پوری دنیا کے سامنے ہم بالکل ننگے (Exposed) تھے اور خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ دنیا میں جس کسی نے بھی ہمارے ملٹری ایکشن کی کسی درجے میں مدافعت کی اسے کس قدر بوجھ اپنے ضمیر پر ڈالنا پڑا ہو گا۔ خود ہم اپنے موقف کی مدافعت میں زیادہ سے زیادہ جو بات کہہ سکے وہ یہ تھی کہ اس حمام میں صرف ہم ہی

ننگے نہیں ہیں بلکہ ع "ایں گناہیست کہ در شہر شما نیز کنند!" بھارت نے بھی تو کشمیر میں یہی کیا تھا اور خود رُوس بھی تو اپنے کئی حلیف ممالک میں یہی کچھ کر چکا ہے----!

اس معاملے کا افسوس ناک ترین پہلو یہ ہے کہ اس مسئلے میں بعض ایسے لوگوں نے بھی نہ صرف یہ کہ حکومتِ وقت کی تائید کی اور اس پر تحسین و آفرین کے ڈونگرے برسائے بلکہ عملاً امداد اور تعاون کی روش اختیار کی اور ایک بددیانت اور شرابی و زانی ٹولے کا آلۂ کار بننا قبول کر لیا جو اس ملک کے سیاسی میدان میں حق و صداقت کے سب سے بڑے علمبردار رہے ہیں اور جن کا سارا سیاسی کاروبار دین و مذہب کے نام پر چل رہا ہے۔ ہمارا دل اس تصور سے کانپ اٹھتا ہے کہ اگر ع "قیاس کن زِ گلستانِ من بہار مرا!" کے مصداق اسی واقعے کو ہماری قوم کی اخلاقی حس کو ماپنے کے لئے پیمانہ بنا لیا جائے تو نتیجہ کیا نکلے گا!---- ظلم اور دھاندلی کے خلاف بولنے کی جرأت اور ہمت نہ ہو تو کم سے کم خاموش تو رہا جا سکتا ہے۔ یہ کتنی بڑی ابن الوقتی اور جواری پن ہے کہ انسان اپنے مفادات پر نگاہ رکھتے ہوئے اور ذاتی مواقع کے پیش نظر کسی ظالم کے ظلم میں اس کا ساجھی اور مددگار بن جائے۔ ہماری قوم کے اخلاقی دیوالیہ پن کا اس سے بڑا ثبوت اور کیا ہو گا کہ اس دھاندلی کے آغاز میں تو مغربی پاکستان کی اکثریتی پارٹی کا لیڈر اس کا آلۂ کار بن گیا اور دوسرے مرحلے (Phase) میں جب اس لیڈر کو ہوش آ گیا اور اس نے دبی زبان سے ہی سہی ظلم کے خلاف کسی قدر بولنا شروع کیا تو اس ملک میں مذہب و سیاست کی سب سے بڑی علمبردار جماعت کو اس ظلم اور زیادتی کا آلہ کار بننے کا شرف حاصل ہو گیا۔

شکست کے اسباب و عوامل میں سے دوسرا گہرا سبب یہ ہے کہ ہم تاحال سیاسی اعتبار سے ایک "نابالغ" قوم ثابت ہوئے ہیں اور ہمارے یہاں جو ذمہ داریاں کسی قومی قیادت کو سنبھالنی چاہئیں تھیں ان کا بوجھ بھی فوج کو اٹھانا پڑا ہے۔ جدید دور کی ریاست (State) ایک بڑا عظیم اور ہمہ گیر ادارہ ہے اور اس میں مختلف ذمہ داریاں مختلف طبقوں کو اٹھانی پڑتی ہیں اور ع "ہر کسے را بہر کارے ساختند!" کے مصداق ہر طبقے کو اپنی مخصوص ذمہ داریوں کے لئے مناسب تربیت (Training) دی جاتی ہے اور جس طرح ملک کے دفاع اور اس کی سرحدوں کا تحفظ نہ عوام کے بس کا ہے نہ سِوِل انتظامیہ کے، اسی طرح اہل سیاست کے حصے کا بوجھ نہ فوج اٹھا سکتی ہے نہ سِوِل انتظامیہ۔ اور کسی قومی تنظیم اور قومی قیادت کے خلا کو کوئی دوسرا ادارہ پُر نہیں کر سکتا۔

اس اعتبار سے دیکھا جائے تو ہماری حالیہ شکست قومی اور اجتماعی سطح پر ہماری مسلسل ناکامیوں (Failures) اور درجہ بدرجہ پسپائی کا نقطہ عروج (Climax) ہے اور بظاہر تو یہ نتیجہ ہے صرف ہماری فوج بلکہ صحیح تر الفاظ میں اس کی بھی صرف سابق عیاش اور بدکردار قیادت کے بودے پن کا' لیکن درحقیقت یہ منطقی انتہا ہے ہمارے سیاسی دیوالیہ پن کی اور مظہرِ اَتم ہے پوری پاکستانی قوم کی نااہلیت اور ناقابلیت اور اجتماعی وسیاسی نابالغی کا!

جیسا کہ ہم نے جولائی ۶۹ء کے محولہ بالا "تذکرہ و تبصرہ" میں بھی عرض کیا تھا' پاکستان کی رُبع صدی کی مختصر سی تاریخ کے ابتدائی گیارہ سالوں کے دوران' یعنی ۴۷ء تا ۵۸ء تک کے عرصے میں' پاکستان کے سیاست دانوں کی نااہلی و ناقابلیت کا تدریجی ظہور ہوا اور اس کے اختتام کے قریب قطعی طور پر ثابت ہو گیا کہ پاکستان کی سیاسی جماعتیں اور شخصیتیں اس عظیم مملکت کی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے میں بالکل ناکام ہو چکی ہیں اور ان کے ہاتھوں اب کسی خیر کی کوئی توقع نہیں کی جا سکتی۔ اس کے فطری نتیجے کے طور پر ۱۹۵۸ء میں ایک انقلاب آیا جو بظاہر اور ابتدائً تو فوجی تھا لیکن اس نے بہت جلد ایک سابق فوجی کے زیر سربراہی ایک خالص نوکر شاہی کی صورت اختیار کر لی اور اہل سیاست کو میدان سے ہٹا کر مملکت کے دوسرے منظم ادارے یعنی سِول سروسز نے ملک کے نظم و نسق کو سنبھال لیا۔ چنانچہ دوسرا گیارہ سالہ دور جو ۵۸ء تا ۶۹ء تک جاری رہا درحقیقت بیوروکریسی کا دور تھا اور اس کے دوران قوم کے اس دوسرے طبقے کی بھی بھرپور آزمائش ہو گئی' لیکن افسوس کہ اس دور کے بالکل ابتدا ہی سے ظاہر ہونا شروع ہو گیا تھا کہ قوم کا یہ طبقہ بھی دیانت و امانت اور احساسِ فرض کے ان اوصاف سے بہت حد تک عاری ہے جو اس عظیم ذمہ داری کو کماحقہٗ ادا کرنے کے لئے لازمی ہیں جو اس کے کندھوں پر آ پڑی ہے۔ چنانچہ رفتہ رفتہ اس طبقے کی نااہلیت بھی واضح ہوتی چلی گئی اور ۶۸ء کے اواخر میں بے اطمینانی کا وہ لاوا جو قوم کے مختلف طبقات میں اس طبقے کی دست درازیوں کے باعث کھول رہا تھا اچانک پھٹ پڑا اور اس طرح یہ دور بھی دیکھتے ہی دیکھتے ختم ہو گیا۔

ان دونوں طبقات کی ناکامی کے بعد ملک و ملت کے پاس ایک ہی منظم ادارہ باقی رہ گیا ہے' یعنی فوج۔ چنانچہ اب کی بار ایک خالص "جرنیلی حکومت" قائم ہوئی اور فوج نے ملک کے پورے نظم و نسق کو سنبھالا۔ ہم نے اسی وقت عرض کر دیا تھا کہ :

"اس ادارے کا اصل فریضہ دفاعِ وطن ہے اور یہ بجائے خود اتنی عظیم ذمہ داری ہے کہ اس پر کوئی مزید بوجھ ڈالنا صد درجہ ناانصافی ہے۔ بین الاقوامی حالات جس رخ پر جا رہے ہیں اس کے پیش نظر مستقبل میں دفاع وطن کی ذمہ داری یقیناً پہلے سے بھی کہیں زیادہ بھاری اور بوجھل ہو جائے گی اور ڈیفنس سروسز کے کندھوں پر اگر زیادہ دیر تک ملک کے داخلی نظم و نسق کا بوجھ بھی پڑا رہا تو اس سے دفاع وطن کے محاذ کے متأثر ہونے کا اندیشہ ہے اور یہ خطرہ اتنا بڑا ہے کہ اسے کسی قیمت پر بھی قبول نہیں کیا جا سکتا"۔

اب اگر یہ ادارہ ان دو طرفہ ذمہ داریوں کا بوجھ اٹھانے میں ناکام ہوا تو اس کا الزام جتنا اس کے سر آتا ہے اتنا ہی بلکہ اس سے کہیں زیادہ پوری قوم پر آتا ہے کہ اس نے اس پر اس کی بساط سے زیادہ بوجھ ڈالا ہی کیوں۔ لہٰذا سابق صدر یحییٰ خان اور ان کے رفقائے کار کی نااہلیت کے پردے میں دراصل پوری قوم کی ناقابلیت کا ظہور ہوا ہے اور ان کی ناکامی اصلاً پوری قوم کی ناکامی ہے۔ یہ بالکل دوسری بات ہے کہ اربابِ سیاست اور بیورو کریسی کی نااہلیوں اور ناکامیوں کے نتائج صرف اندرونِ ملک بد انتظامی اور بے چینی و خلفشار تک محدود رہے تھے اور فوج کی ناکامی نے ہماری خامیوں اور نااہلیوں کا بھانڈا بین الاقوامی چوراہے میں پھوڑ کر رکھ دیا اور ہم اپنے قدیم دشمن کے ہاتھوں ایک شرمناک شکست سے دوچار ہو گئے۔

مزید گہرائی میں اتر کر دیکھئے تو معلوم ہوتا ہے کہ اس پوری صورت حال کی تہہ میں دراصل وہی الجھاؤ (DILEMMA) کار فرما ہے جس کا ذکر ہم نے نومبر ۷۱ء کی اشاعت میں شائع شدہ اپنی ایک تقریر میں کیا تھا۔ یعنی یہ کہ ایک طرف تو نہ پاکستان کے قیام کے لئے کوئی وجہ جواز مذہب کے سوا موجود ہے اور نہ ہماری قومیت کے لئے کوئی اساس دین کے سوا کسی چیز کو قرار دینا ممکن ہے۔ گویا کہ نظری اعتبار سے تو ہماری قومیت بھی صرف اور صرف اسلام ہے اور ہمارا وطن {۱} بھی صرف اور صرف اسلام ہے لیکن دوسری طرف عملاً صورت حال یہ ہے کہ یہی چیزیں یہاں کم ہوتے ہوتے بالکل معدوم کے حکم میں آ گئی ہیں۔ اس لئے کہ قیامِ پاکستان کے وقت تو پھر بھی' چاہے ایک جذباتی اور سطحی سی نوعیت ہی کا سہی' بہرحال ایک "جذبہ ملی" ہمارے یہاں موجود تھا' لیکن بعد میں نہ صرف یہ کہ اسے غذا نہیں ملی' بلکہ رفتہ رفتہ ان جڑوں ہی کو کھود ڈالا گیا جو اسے امکانی طور پر سینچ

{۱} "اسلام ترا دیس ہے تو مصطفوی ہے!"

سکتی تھیں۔ نتیجتاً اس وقت ہم بحیثیتِ قوم فضا میں معلق ہیں اور باوجود اس کے کہ ہمارے نیچے ایک ایسا خطۂ زمین موجود ہے جسے دنیا مغربی پاکستان کے نام سے جانتی ہے حقیقت یہ ہے کہ ہماری قومیت کی کوئی بنیاد بالفعل موجود نہیں۔

اب ظاہر ہے کہ قومی و ملی کردار اور سیاسی و اجتماعی شعور بہر حال کسی تصورِ قومیت ہی کی اساس پر وجود میں آسکتے ہیں اور کسی ملک کے رہنے والوں میں فکر کی کوئی ہم آہنگی' سوچ کی یکسانیت اور مقاصد کی یک جہتی کسی مشترک قومی جذبے ہی کی بنیاد پر پیدا ہو سکتی ہے' بلکہ خود انفرادی سیرت و کردار کی تشکیل و تعمیر کا انحصار بھی بہت حد تک اس اجتماعی شعور ہی پر ہوتا ہے۔ اس لئے کہ۔

فرد قائم ربطِ ملّت سے ہے تنہا کچھ نہیں
موج ہے دریا میں' اور بیرونِ دریا کچھ نہیں

تو بحالاتِ موجودہ ہمارے اندر کوئی روح بیدار ہو تو کیسے؟ ہمارے قومی کردار کی تعمیر ہو تو کس طرح اور ملک و ملت کے لئے قربانی اور ایثار کا جذبہ پروان چڑھے تو کس بنیاد پر؟ یہی اصل سبب ہے اس کا کہ نہ ہمارے اندر کوئی اجتماعی شعور بیدار ہوا نہ کوئی قومی نقطہ نظر پیدا ہو سکا' نہ کوئی قومی تنظیم وجود میں آسکی' نہ کوئی قومی قیادت ابھر سکی۔ نتیجتاً ناکامیوں کا ایک سلسلہ چل نکلا۔ پہلے اہل سیاست ناکام ہوئے' پھر بیوروکریسی فیل ہوئی اور آخر کار فوج کی ناکامی کی صورت میں ہمارے قومی وقار کو وہ دھکا لگا جس کی یاد نسلوں تک باقی رہے گی اور جس کی تلافی خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ کب اور کس صورت میں ممکن ہو سکے گی!

افسوس کہ گزشتہ تین مہینوں کے دوران جو حالات و واقعات رونما ہوئے انہوں نے ان دو نکات' یعنی ایک یہ کہ پاکستان کی بحیثیتِ ملک اور اس میں بسنے والوں کی بحیثیتِ قوم کوئی اساس اور بنیاد اسلام کے سوا موجود نہیں اور دوسرے یہ کہ یہی جنس اب یہاں عنقا کے حکم میں ہے' کو نہایت تلخ لیکن حد درجہ سنگین حقائق کی طرح ہماری آنکھوں کے سامنے لا کر رکھ دیا ہے' چنانچہ ایک طرف ملک کے دو ٹکڑے ہو گئے اور ایک "علاقائی قومیت" نے پاکستانی قومیت کے تصور پر فتح حاصل کرلی۔ علیحدگی پسندی کے اس عمل کا آغاز تو فطری طور پر وہیں سے ہوا جہاں جغرافیائی فاصلے کی ایک اضافی پیچیدگی بھی موجود تھی لیکن خود مغربی پاکستان میں بھی یہ عمل اندر ہی اندر جاری ہے اور حقیقت بین نگاہیں دیکھ رہی ہیں کہ مغربی پاکستان میں شمالاً جنوباً وہ دراڑ پڑ چکی ہے جو بڑھ کر کسی

خوفناک کھائی میں تبدیل ہو سکتی ہے ---- اور دوسری طرف پاکستان کے دونوں خطوں میں وہ قیادتیں برسرکار آگئی ہیں جن کا اور چاہے کسی بھی چیز سے کتنا ہی مضبوط رشتہ کیوں نہ ہو دین و مذہب سے بہرحال کوئی تعلق نہیں ہے۔ چنانچہ "بنگلہ دیش" کی حکمران جماعت کے تو متعدد ذمہ دار لوگ کہہ ہی چکے ہیں کہ ہمارے تین بنیادی اصول وہی ہیں جن پر بھارت عمل پیرا ہے یعنی لادینیت جمہوریت اور سوشلزم' بلکہ یہاں تک کہا گیا ہے کہ "اگرچہ بنگلہ دیش مسلمانوں کی تعداد کے لحاظ سے دنیا میں دوسرا سب سے بڑا ملک ہے تاہم ہم یہ پسند نہیں کریں گے کہ اسے ایک مسلمان ملک کہا جائے"۔ اور ایک صاحب تو یہاں تک غزل سرا ہوئے ہیں کہ "ہم بنگلہ دیش میں اسلام کو کچل کر رکھ دیں گے!"۔ وَقِس علٰی ھٰذا۔ اِدھر مغربی پاکستان میں بھی اب وہ قیادت برسراقتدار آ گئی ہے جو اس نظریئے کی حامل ہے جسے ہمارے ملک کے ایک صد و چودہ علماء کرام نے کفر قرار دیا تھا۔ اور جو اگرچہ قولاً جمہوریت اور سوشلزم کے ساتھ اسلام کا پیوند بھی لگاتی ہے لیکن جس کی سیاست خالصتاً سیکولر اصولوں پر قائم ہے' چنانچہ وہ طریق انتخاب کے مسئلے میں کھلم کھلا جداگانہ کی بجائے مخلوط انتخابات کی حامی رہی ہے اور اگرچہ وہ اس امر کی مدعی ہے کہ "اسلام ہمارا دین ہے" تاہم اس سوال سے قطعاً بحث کرنے کو تیار نہیں کہ کون مسلم ہے اور کون غیر مسلم!

متذکرہ بالا مباحث سے راقم الحروف کے نزدیک تین اہم نتائج مستنبط ہوتے ہیں :

ایک یہ کہ اگرچہ ملکی اور ملی استحکام کے لئے کرنے کے کام بے شمار ہیں تاہم پاکستان کا اصل استحکام اور ملتِ اسلامیہ پاکستان کے اتحاد اور یکجہتی کا اصل دار و مدار "احیائے اسلام" پر ہے۔ چنانچہ اگر کوئی شخص صرف بعض سماجی برائیوں (SOCIAL EVILS) مثلاً رشوت یا جہیز کی رسم ایسی چیزوں کے استیصال (ERADICATION) کے لئے کوئی حقیقی اور واقعی محنت کرتا ہے تو ہمارے نزدیک وہ بھی یقیناً قومی تعمیرِ نو ہی کا ایک کام کر رہا ہے اور اسے ملک و ملت کے ہر بہی خواہ کی اشیرواد حاصل ہونی چاہئے' لیکن ع "خاص ہے ترکیب میں قومِ رسولِ ہاشمی" کے مصداق پاکستان دنیا کا ایک ایسا انوکھا ملک ہے جس کی واحد اساس مذہب ہے اور اس میں بسنے والے لوگ دنیا کی وہ واحد قوم ہیں جن کی قومیت کی کوئی بنیاد مذہب کے سوا موجود نہیں' لہٰذا یہاں ملک اور ملت دونوں کا

استحکام" آخری تجزیے میں، صرف ایک ہی شے سے وابستہ ہے اور وہ ہے احیائے دین ومذہب۔

اور یہ، ایک اعتبار سے، ایک بہت بڑی خوش قسمتی بھی ہے، اس لئے کہ انسان کو عقیدے، قومیت اور وطنیت کی ایسی "وحدت" شاذ ہی نصیب ہوتی ہے۔ ذرا ہندوستان کے کسی مسلمان کی حالتِ زار کو ذہن میں لائیے کہ وہ کیسے انتشارِ ذہنی اور خلفشارِ قلبی کا شکار ہے کہ اس کے دین و مذہب کے تقاضے اس کے دل و دماغ سے کچھ اور ہیں اور ملک و وطن کے تلخ حقائق اسے کسی اور جانب چلنے پر مجبور کرتے ہیں۔ حتیٰ کہ کسی عرب ملک کے دیندار مسلمان کا حال بھی یہ ہے کہ اس کا دین اسلام ہے، قومیت عربی اور وطنیت مصری یا سعودی یا اردنی۔ اس کے برعکس ایک پاکستانی مسلمان ہے کہ اس کا دین بھی اسلام، قومیت بھی اسلام اور وطن بھی اسلام۔

اس اعتبار سے حقیقت یہ ہے کہ میں خود اپنے آپ کو دنیا کا خوش قسمت ترین انسان سمجھتا ہوں کہ جب میں احیائے دین کے لئے کسی حقیری خدمت میں اپنے آپ کو کھپا رہا ہوتا ہوں تو مجھے کامل اطمینان حاصل ہوتا ہے کہ میں اپنے خالق و مالک کا حق بھی ادا کر رہا ہوں اور اپنی قوم اور ملک کا بھی۔ اس لئے کہ میری قوم کا اتحاد بھی اصلاً اسی میں مضمر ہے اور ملک کے استحکام کا دارومدار بھی حقیقتاً اسی پر ہے۔

دوسرا نتیجہ یہ ہے کہ "احیائے اسلام" اور "احیائے دین و مذہب" کا کام فی الوقت سیاسی میدان میں نہیں کیا جاسکتا بلکہ ابھی ایک عرصے تک اس غرض کے لئے پوری قوت تعلیم و تدریس اور فکر و ادب کے میدان میں کھپانی ہوگی اور توجہ کو معاشرتی اور سماجی دائروں میں مرتکز رکھنا ہوگا۔ اس لئے کہ یہ ایک اٹل حقیقت ہے کہ کسی ملک کے سیاسی میدان میں صرف وہی اقدار بروئے کار آسکتی ہیں جو فی الواقع معاشرے میں رچی بسی ہوئی ہوں اور لوگوں کے دلوں اور دماغوں میں گہری جڑیں رکھتی ہوں۔ عوام کی سوچ کے زاویوں اور ان کی بنیادی اقدار کو بدلے بغیر سیاست کے میدان میں کسی انقلاب یا حقیقی تبدیلی کی توقع نہایت احمقانہ ہے۔ اور ادھر حال یہ ہے کہ فی الواقع ہمارے معاشرے میں دینی اقدار نہایت مضمحل بلکہ تقریباً مردہ ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ گزشتہ چوبیس سالوں کے دوران اس ملک کی سیاسی فضا میں جو کام دین کے نام پر کیا گیا وہ قطعاً بے ثمر اور لاحاصل ثابت ہوا۔

دوسری جانب مندرجہ ذیل معروضی حقائق ہیں جن کی تفصیل میں جانا اس وقت ممکن نہیں :

(تفصیل کے لئے دیکھئے راقم کی تالیف "استحکام پاکستان")

۱۔ ہماری ایک عظیم اکثریت کا دین و مذہب کے ساتھ سرے سے کوئی تعلق نہیں!

۲۔ مذہب کے متوسلین کی اکثریت کا تصورِ دین محدود بھی ہے اور مسخ شدہ بھی!

۳۔ وسیع تر تصور کے حامل لوگوں کی اکثریت بھی بالکل بے عمل ہے!---اور

۴۔ فعّال مذہبی عناصر کا مجموعی اثر و نفوذ بھی نہایت قلیل اور ناقابل شمار ہے!!

یہ حقائق اگرچہ نہایت تلخ ہیں تاہم ہیں بالکل واقعی جن کا انکار سوائے ہٹ دھرمی اور بے جا ضد کے کسی طرح ممکن نہیں۔ تو سوچنا چاہئے کہ دین کے مستقبل سے حقیقی دلچسپی رکھنے والوں کا فی الوقت سیاسی میدان میں اپنی قوتوں کو ضائع کرتے رہنا آخر چہ سود؟

اس سے بھی بڑھ کر ہم چاہتے ہیں کہ ایسے لوگوں کے حقِ نصح کی ادائیگی کے طور پر یہ عرض کر دیں کہ ملک کے سیاسی میدان میں اسلام کے نام پر جو کچھ ہوا اب تک تو وہ صرف لاحاصل اور بے کار ہی رہا ہے لیکن آئندہ انتہائی خطرناک بھی ہو سکتا ہے' اور اس وقت خود حکمتِ عملی کا تقاضا بھی یہی ہے کہ اس میدان سے پسپائی اختیار کر کے پوری قوت کو تعلیم و تدریس اور ذہنی و فکری انقلاب پر مرکوز کر دیا جائے! یہ بات ہم بہت پہلے سے کہہ رہے ہیں لیکن اکثر و بیشتر ہماری بات کو کسی ضد یا تعصب پر محمول کیا گیا۔ لیکن اب حقائق تلخ ترین صورت میں سامنے آ چکے ہیں۔ کاش کہ اب بھی لوگ سوچنے پر آمادہ ہو جائیں اور ایک غلط میدان میں قوتوں کو ضائع کرتے رہنے سے باز آ جائیں!

تیسرا نتیجہ جو دراصل دوسرے نتیجے ہی کی منطقی انتہا ہے' یہ ہے کہ چونکہ دین کا قصر بنیادوں تک منہدم ہو چکا ہے لہٰذا اس کی سرسری مرمت سے کام نہیں چل سکتا بلکہ ضرورت بنیاد سے از سرِ نو تعمیر کی ہے' یا بالفاظِ دیگر یہ مرحلہ درحقیقت "قیامِ نظامِ اسلامی" کا نہیں بلکہ "تجدیدِ ایمان" اور "تعمیرِ یقین" کا ہے اور "احیائے اسلام" کے لئے لازم ہے کہ پہلے پورے معاشرے میں "احیائے ایمان" کی ایک ہمہ گیر تحریک برپا ہو جائے اور ایمان و یقین کی روشنی سے ہمارا معاشرہ جگمگا اٹھے۔

اس مرحلے پر ایک نگاہ بازگشت اپنے معاشرے پر اس اعتبار سے دوبارہ ڈال لیجئے کہ اس کے مختلف طبقات میں ایمان اور یقین واقعتاً کس حال میں ہیں۔

ہماری رائے میں ایمان اور یقین کا جائزہ لینے کی غرض سے ہم اپنے معاشرے کو تین طبقات میں تقسیم کرسکتے ہیں :

سب سے بڑا طبقہ عوام الناس پر مشتمل ہے جن کے یہاں ایمان در حقیقت نام ہے چند موروثی عقائد کا' جن کا ان کے فہم اور شعور سے کوئی تعلق نہیں۔ چنانچہ انہوں نے چند اعتقادات کو اپنے ذہن کے کسی گوشے میں بس رکھ تو لیا ہے لیکن ان کا کوئی لحاظ نہ رکھتے ہوئے زندگی کی عملی روش کو زمانے کے عام بہاؤ کے رخ پر ڈال دیا ہے --- اور اس سے زیادہ کی ان سے توقع بھی فضول ہے۔

دوسرا بڑا اور اہم ترین طبقہ پڑھے لکھے' سمجھدار' اور جدید تعلیم یافتہ لوگوں پر مشتمل ہے' جن میں ڈاکٹر' انجینئر' وکلاء' سی ایس پی افسر' کالجوں اور یونیورسٹیوں کے پروفیسر بلکہ یونیورسٹیوں کی زیر تعلیم نسل بھی شامل ہے۔

اس طبقے کی اکثریت' حقیقت یہ ہے کہ خالص ملحد لوگوں پر مشتمل ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ ان میں سے اکثر "خاموش ملحد" ہیں اور اپنے الحاد کو زبان پر نہیں لاتے' اگرچہ ایک چھوٹی سی اقلیت ایسے نسبتاً زیادہ جری اور بے باک لوگوں کی بھی موجود ہے جو کھلم کھلا اپنے الحاد کا اقرار اور اعلان کرنے سے نہیں ہچکچاتے!

اس میں کوئی شک نہیں کہ اس جدید تعلیم یافتہ طبقے میں خاصی تعداد میں ایسے بھلے لوگ بھی موجود ہیں جو کم از کم ایک ثقافت کی حد تک اسلام کے دامن سے وابستہ ہیں اور کچھ نماز روزہ کر لیتے ہیں۔ لیکن زیادہ گہرے تجزیئے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کی بھی ایک عظیم اکثریت ذہنی و فکری اعتبار سے دوغلی شخصیت (Split Personality) کی حامل ہے اور انہوں نے اپنے دماغ کے ایک کونے میں مذہب اور اس کے معتقدات کو رکھ چھوڑا ہے اور دوسرے خانے میں جدید افکار و نظریات کو' اور ان دونوں کو متضاد متصور کرتے ہوئے بھی بیک وقت قبول کر رکھا ہے۔

مثال کے طور پر جدید علم الحیات (Biology) جس شخص نے بھی پڑھا ہے وہ ڈارون کے نظریۂ ارتقاء کو ایک واقعہ تصور کرنے پر مجبور ہے یا کم از کم اس کی تردید کے لئے کوئی تشفی بخش دلائل نہیں رکھتا۔ دوسری طرف عام خیال یہی ہے کہ یہ نظریہ قرآن حکیم کے نظریۂ تخلیق و ہبوطِ آدم کی عین ضد ہے۔ لیکن ہمارے ڈاکٹروں اور علم الحیوانات یا علم النباتات کے فارغ التحصیل

لوگوں میں بہت سے ایسے نیک سرشت لوگ بھی موجود ہیں جو ان دونوں کو بیک وقت مانتے بھی ہیں اور ساتھ ہی ان کے دلوں میں یہ چور بھی موجود ہے کہ ہیں یہ دونوں چیزیں باہم متضاد اور ایک دوسرے کی کامل ضد!

حقیقت یہ ہے کہ ہماری قوم کے طبقہ متوسط کے بہت سے دینی مزاج رکھنے والے لوگ جو فعال مذہبی جماعتوں سے بھی وابستہ ہیں خود اس باطنی روگ کا شکار ہیں کہ ان کے اپنے دین و ایمان کو جدید علوم و فنون اور نظریات و افکار نے اندر سے کھوکھلا کر کے رکھ دیا ہے۔

تیسرا طبقہ علماء کرام کا ہے۔ اس طبقے میں بلاشبہ کہیں کہیں علم و عرفان کی شمعیں روشن ہیں' لیکن یہ بھی ایک تلخ حقیقت ہے کہ اس طبقے کی بھی اکثریت کا حال یہ ہے کہ اگرچہ ایمان کے اعلان میں سب سے زیادہ بلند و بانگ وہی ہیں لیکن عملی زندگی میں ان کی کیفیت خالص دنیاداری بلکہ دنیا پرستی کا نقشہ پیش کرتی ہے۔ چنانچہ عوام الناس میں ایک کہاوت مشہور ہو چکی ہے کہ "مولوی جو کہے اسے سن بھی لیا کرو اور حتی الامکان اس پر عمل کی کوشش بھی کرو' لیکن جو کرے اسے دیکھا مت کرو"۔ یہ ہے حال ہمارے معاشرے کا ایمان اور یقین کے اعتبار سے!

چنانچہ ہمارے نزدیک تو "کرنے کا اصل کام" وہی ہے جو ہم نے تفصیل کے ساتھ اپنے کتابچے "اسلام کی نشاۃ ثانیہ" میں بیان کیا ہے۔ یعنی یہ کہ قرآن حکیم کی روشنی میں وقت کی اعلیٰ ترین علمی سطح پر ایک ایسی زبردست فکری تحریک برپا کی جائے جو ایک طرف منفی طور پر جدید مادہ پرستانہ اور ملحدانہ افکار و نظریات کا مدلل ابطال کرے اور دوسری طرف مثبت طور پر معاشرے کے پڑھے لکھے اور ذہین طبقے (Intelligentsia) کے قلوب و اذہان میں ایمان اور یقین کی شمعیں روشن کر دے۔ اس لئے کہ جہاں تک عوام الناس کا تعلق ہے ان کے قلوب میں تو نورِ ایمان صرف اصحابِ یقین کی صحبت سے بھی پیدا ہو سکتا ہے اور یہ کام ہمارے معاشرے میں اس گئے گزرے دور میں بھی کسی نہ کسی درجے میں ہو رہا ہے' یعنی جیسا کہ ہم نے اوپر عرض کیا علماء کرام کے حلقوں میں کہیں کہیں علم و عرفان کی جو شمعیں روشن ہیں ان سے عوام الناس کی حد تک ماحول میں کچھ نہ کچھ نورِ ایمان سرایت کر ہی رہا ہے' لیکن متذکرہ بالا ذہین طبقہ اپنے ذہن کی ساخت اور مزاج کی افتاد کے اعتبار سے مجبور و محتاج ہے کہ پہلے ان کے ذہن کی گرہیں کھولی جائیں' اور اسے گمراہ کن افکار و نظریات سے خلاصی دلائی جائے' تب ہی ان کے قلوب و اذہان ایمان اور یقین کی روشنی کو قبول کرنے کے

لئے تیار ہو سکیں گے!---- اس موضوع پر ہم تفصیل کے ساتھ اپنے متذکرہ بالا کتابچے میں گزارشات پیش کر چکے ہیں۔ اور جہاں تک راقم الحروف کا تعلق ہے اس کا حال تو اس معاملے میں واقعتاً اب وہ ہو چکا ہے کہ ۔

ما ہر چہ خواندہ ایم فراموش کردہ ایم
اِلّا حدیثِ دوست کہ تکرار می کنیم

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ زندگی کو تعلیم و تعلّمِ قرآن ہی میں صرف کر دینے کی توفیق عطا کئے رکھے! آمین ۔

بقیہ : "....وقتِ دعا ہے !"

کی نشر و اشاعت اور اس کے دین کے غلبے کے مقصد میں صرف ہو گا اور وہ
پاکستان میں ایک صحیح معنی میں اسلامی معاشرہ اور حقیقی معنوں میں اسلامی
ریاست کے قیام کو اپنی زندگی کا اصل نصب العین بنائے رکھے گا۔

تب اگر وہ اللہ تعالیٰ سے پاکستان کی سلامتی کی دعا کرے گا تو وہ یقیناً مقبول ہو گی۔ راقم خود اسی عزم اور ارادے کے ساتھ بارگاہِ خداوندی میں پاکستان کی فتح کی درخواست پیش کرتا ہے اور ساتھ ہی جاننا چاہتا ہے کہ کون ہیں وہ لوگ جو اس عزم اور ارادے میں اس کے ساتھ ہیں------ رَبَّنَا ظَلَمْنَا اَنْفُسَنَا وَاِنْ لَّمْ تَغْفِرْلَنَا وَتَرْحَمْنَا لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ۔ اَللّٰهُمَّ اغْفِرْلَنَا ذُنُوْبَنَا وَاِسْرَافَنَا فِىْ اَمْرِنَا وَثَبِّتْ اَقْدَامَنَا وَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ۔ آمین یا ربَّ العٰلمین!!

قرآن حکیم کی مقدس آیات اور احادیث آپ کی دینی معلومات میں اضافے اور تبلیغ کے لیے شائع کی جاتی ہیں۔ ان کا احترام آپ پر فرض ہے لہٰذا جن صفحات پر یہ آیات درج ہیں ان کو صحیح اسلامی طریقے کے مطابق بے حرمتی سے محفوظ رکھیں۔

KHALID TRADERS

IMPORTERS – INDENTORS – STOCKISTS &
SUPPLIERS OF WIDE VARIETY OF BEARINGS,
FROM SUPER – SMALL TO SUPER – LARGE

AUTHORIZED AGENTS
NTN
BEARINGS

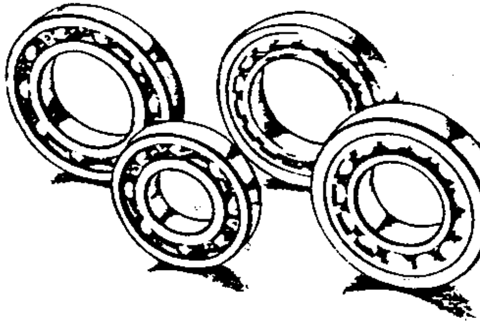

PLEASE CONTACT

TEL : 7732952-7735883-7730593
G.P.O. BOX NO. 1178, OPP KMC WORKSHOP
NISHTER ROAD, KARACHI-74200 (PAKISTAN)
TELEX : 24824 TARIQ PK CABLE : DIMAND BALL FAX : 7734776

FOR AUTOMOTIVE BEARINGS : Sind Bearing Agency 64 A-65,
Manzoor Square Noman St. Plaza Quarters Karachi-74400 (Pakistan)
Tel : 7723358-7721172

LAHORE :
(Opening Shortly)
Amin Arcade 42,
Brandreth Road, Lahore-54000
Ph : 54169

GUJRANWALA :
1-Haider Shopping Centre, Circular Road,
Gujranwala Tel : 41790-210607

WE MOVE FAST TO KEEP YOU MOVING

MONTHLY
Meesaq
LAHORE

Reg. No. L 7360
Vol. 45 No. 7
July, 1996

Quarterly Journal of the Qur'an Academy

The Qur'anic Horizons

Patron: Dr. Israr Ahmad

April-June '96 issue is now available!

Contents

- The Spirit of Revolution (Editorial)
- The Objective and Goal of Muhammad's Prophethood (SAAWS) - II (By Dr. Israr Ahmad)
- The Qur'an and *Riba* (By Dr. Sayyid Tahir)
- Islamic Revolutionary Thought and its Decline (By Dr. Israr Ahmad)
- In Search of Knowledge (By Farhan Shamsi)

Send orders to:

Markazi Anjuman Khuddam-ul-Qur'an Lahore

36-K, Model Town, Lahore-54700